UNIVERSAL
LIBRARY
OU_226420
UNIVERSAL
LIBRARY

226420

Osmania University Library

Call No. ۲۹۷ ۳۴
د
م - ع م

Accession No. 7178

Author محمد علی

Title مقام حدیث

This book should be returned on or before the date last marked below.

1952
CHECKED 1951
کتب خانہ

جملہ حقوق محفوظ

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ

Checked 1965

مقامِ حدیث

Checked 1969.

جس میں

صداقت حدیث ضرورت حدیث جمع حدیث تنقید حدیث

پر بحث ہے

مؤلفہ

مولانا مولوی محمد علی صاحب

مترجم انگریزی ترجمۃ القرآن مع تفسیر و اردو ترجمۃ القرآن

مع تفسیر وغیرہ

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے

شائع کیا

مطبع کریمی لاہور باہتمام میر علی بخش مینجر

ضروری اعلان

میرا ارادہ ہے کہ صحیح بخاری کو ترجمہ اور ضروری نوٹوں کے ساتھ پارہ پارہ کر کے شائع کیا جائے۔ دو پاروں کے نوٹ تیار بھی ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا نمبر مقام حدیث سمجھنا چاہئے۔ ترجمہ بھی انشاء اللہ تعالے سلسلہ وار بہت جلد شائع ہونا شروع ہو جائے گا۔ جو اصحاب مستقل خریدار بننا چاہتے ہوں وہ اپنے نام اور پتہ کی اطلاع مینیجر بک ڈپو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کو دیدیں۔ تاکہ ترجمہ کا ہر نمبر جوں جوں شائع ہو انہیں پہنچتا رہے +

محمد علی

ترجمۃ القرآن انگریزی

Checked 1975

مجلد

از حضرت مولنا مولوی محمد علیؑ صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی

انگریزی زبان میں ترجمۃ القرآن معہ عربی متن۔ فٹ نوٹوں میں نہایت لطیف تفسیر کی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ۔ انگلستان اور ہندوستان کے مشہور اہل قلم نے اس ترجمہ کے متعلق نہایت عمدہ آراء کا اظہار کیا ہے۔

یہ ترجمہ دو ایڈیشنوں میں چھپا گیا ہے +

قسم اول۔ انڈیا پیپر پر جو نہایت خوبصورت لچکدار جلد قیمت بیس روپیہ (عنہ) علاوہ محصول ڈاک +

قسم دوم۔ موٹی مضبوط جلد ولایتی کاغذ قیمت ۱۵ علاوہ محصولڈاک

نوٹ۔ ایک نسخہ پر تقریباً عہ پیکنگ اور محصولڈاک کا خرچ پڑتا ہے +

درخواستیں بنام منیجر بک ڈپو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام احمدیہ بلڈنگس لاہور

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
تمہید	۱
پہلا باب	
صداقت حدیث پر اندرونی اور بیرونی دلیل	۳
جنگی شغل والے صحابہ کی حدیث میں روایت	۴
بخاری میں کثرت روایات علمی اشغال والے صحابہ سے ہے۔	۵
مولوی عبداللہ چکڑالوی کے خیالات کہ حدیث سینکڑوں برس بعد بنی	۵
ان خیالات کا عقلی محال	۶
دوسرا باب	
صداقت حدیث پر خارجی شہادت	۱۰
مکتوب آنحضرت صلعم بنام مقوقس	۱۰
اصل خط کی دریافت	۱۱
حیرت انگیز مطابقت اور اس سے نتائج	۱۲
آنحضرت صلعم کی مہر	۱۳
مہر کا نقش مطابق حدیث اور اس کا عکس سے مقابلہ	۱۴
احادیث میں پیشگوئیاں	۱۵
شام و ایران کی فتح کی پیشگوئیاں	۱۶
احادیث کی وہ پیشگوئیاں جو کتب حدیث کی اشاعت کے بعد پوری ہوئیں	۱۷
فتح قسطنطنیہ	۱۷
خروج نار کی پیشگوئی	۱۸
تیسرا باب	
ضرورت حدیث	۲۲
فہم قرآن میں ہم حدیث کے محتاج ہیں	۲۲
خدا قوانین کا محتاج نہیں مگر انسان ہے	۲۳
قرآن کے مفصل ہونے کے باوجود مولوی عبداللہ کی تشریحات	۲۴
قرآن میں تکبیر کے وقت کان پکڑنے کا حکم	۲۷
قرآن سے نماز کی رکعتوں کی تعداد	۲۸
نئے اہل قرآن اور ان کی نماز	۳۰
مولوی عبداللہ صاحب اور ان کے شاگردوں میں اختلاف باوجودیکہ قرآن مفصل ہے	۳۱
بموجب عقیدہ اہل قرآن نماز امن کا ذکر قرآن میں نہیں نماز خوف کا ہے	۳۲
قصر سے کیا مراد ہے	۳۳

مضمون	صفحہ
عالم اسلامی کا ارکان نماز پر اتفاق	۳۴
فروعی اختلافات	۳۶
نبی کے دو الگ الگ کام آیات محکمات پڑھنا اور ان کی تعلیم دینا	۳۶
تعلیم کا مفہوم	۳۷
قرآن کا پڑھنا اور اس کا بیان دونوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے بتائے ہیں۔	۳۸
بیان کا مفہوم	۳۹
قرآن کریم مفصل ہے مگر مزید تشریح کی ضرورت ہے	״
تفصیل کل شئے سے مراد	۴۰
اصول اور فروع کا فرق	۴۲
قرآن کریم میں متشابہات کی حکمت	۴۴
باریکیوں کو اخذ کرنے والوں کے مدارج کا اختلاف	۴۵
نبی کا فہم وحی خفی ہے	۴۶
نبی کو خاص فہم دیا جاتا ہے	۴۷
نبی کو امور دینی میں فیصلہ کرنے کا اختیار	۴۹
حکم کے ماتحت حکم	۵۰
قرآن میں اطاعت رسول کا ذکر	۵۱
مولوی عبداللہ کی اطاعت رسول کی تفسیر	۵۲
واضح کی تفسیر مبہم سے	۵۳

مضمون	صفحہ
تفسیر واؤ	۵۷
اطاعت رسول کی سب آیات مدنی ہیں	۵۸
مولوی عبداللہ کا اپنے خیال سے ترتیب نزول قایم کرنا	۵۹
آنحضرت صلعم کے احکام ما انزل اللہ میں داخل ہیں	۵۹
قرآن کریم کی ان آیات پر بحث جن میں اطاعت رسول کا ذکر ہے	۶۰
مولوی عبداللہ کا ما مجمل کا ترجمہ	۶۲
اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت اولی الامر	۶۳
وحی خفی کا ذکر قرآن شریف میں	۶۵
قرآن شریف میں نماز اور وضو کے ذکر سے وحی خفی پر کھلا استدلال	۶۶
وحی کے تین رنگ	۶۸
وحی خفی پر دو اعتراض اول آنحضرت سے وقوع سہو یا غلطی	۶۹
دوئم وحی خفی کی حفاظت قرآن شریف کی طرح کیوں نہ ہوئی	۷۱
چوتھا باب	
جمع حدیث	۷۲

مضمون	صفحہ
جمع حدیث پر اعتراض	۷۲
زمانۂ نبوی میں ضرورت حدیث	۷۲
حفاظت حدیث کے لئے آنحضرت صلعم کا خود تاکید کرنا	۷۳
آنحضرت صلعم کی مسائل دینی کو سمجھانے اور یاد کرانے کیلئے دہرانے کی عادت	۷۶
جھوٹی حدیث پر وعید	۷۷
صحابہ کا بیانِ حدیث میں سخت احتیاط سے کام لینا	۷۸
روایت حدیث میں سب صحابہ یکساں نہیں	۷۹
ابوہریرہ کا اشتیاق حفظ حدیث	۸۰
پہلی صدی کے آخر عمر بن عبدالعزیز کے احکام حفاظت حدیث کے لئے	۸۲
صحابہ کا حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لئے لمبے سفر کرنا	۸۳
آنحضرت صلعم کے سامنے بعض احادیث کا تحریر میں آجانا	۸۴
عام طور پر حدیث کے نہ لکھے جانے کے وجوہات	۸۶
عربوں کا حافظہ پر بھروسہ	۸۷
تحریر میں غلطی کا امکان کم نہیں	۸۹
آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جمع حدیث کا شوق	۹۰
جمع حدیث کے پانچ مرحلے پہلا مرحلہ خود زمانۂ نبوی	۹۱
جمع حدیث کا دوسرا مرحلہ زمانۂ صحابہ میں	۹۲
جمع حدیث کا تیسرا مرحلہ زمانۂ تابعین اور درسگاہوں میں تدریس حدیث	۹۴
جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ حدیث پر تصنیفات	۹۵
پانچواں مرحلہ جمع حدیث کے کام کی تکمیل	۹۶
ان پانچوں مرحلوں کے بغیر جمع حدیث کا کام نامکمل رہتا	۹۷
پانچواں باب	
تنقید حدیث	۹۹
میور اور سپرنگر کی رائے محدثین کی تنقید حدیث پر	۹۹
محدثین کے قرار دادہ اصول تنقید حدیث	۱۰۰
محدثین نے اندرونی شہادت اور قرائن سے کام لیا	۱۰۲
روایت کی تنقید مزید احتیاط کے لئے تھی	۱۰۲
زمانۂ صحابہ کے وضعی احادیث سے پاک ہونے کی وجوہات	۱۰۳
علم جرح وتعدیل کی بنیاد ابتدا سے رکھی گئی	۱۰۵
کن حالات میں روایت کو قبول نہ کیا جاتا تھا	۱۰۵
محدثین نے ایک دوسرے سے آزاد	

مضمون	صفحہ
رہ کر تنقید کی	۱۰۷
حدیث میں اختلافات	۱۰۸
محدثین کا شاہان وقت کے اثر کے ماتحت نہ ہونا	۱۱۰
غلطی کا امکان	۱۱۱
بخاری کی فضیلت	۱۱۲
امام بخاری کے اصول تنقید کی سختی	۱۱۲
عیسائی بزرگوں کا دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو جائز رکھنا	۱۱۳
امام بخاری کے ننانوے حدیثوں میں سے ایک کو لینے کے معنی	۱۱۴
صحاح ستہ کے سوا دیگر کتب احادیث میں تنقید میں تساہل	۱۱۴
کیا ہم روایت یا درایت کی رو سے تنقید نہیں کر سکتے	۱۱۵
حدیث موضوع کا پتہ کس طرح لگ سکتا ہے	۱۱۶
تنقید حدیث کے پانچ موٹے اصول	۱۱۶
روایت میں وہ حصہ جس میں قیاس کو دخل دیا گیا ہے	۱۱۷
تعامل میں آئی ہوئی احادیث اور	۱۱۸
دوسری احادیث میں فرق	
روایت میں غلطی کا احتمال	۱۱۹
روایت بالمعنی	۱۲۰
صداقت حدیث کے پرکھنے کیلئے سب سے بڑا معیار	۱۲۱
قرآن کو حدیث پر مقدم کرنے کی ضرورت	۱۲۲
خود حدیث سے قرآن کریم کے حدیث پر مقدم کئے جانے کا ثبوت	۱۲۵
قرآن کریم احادیث کے نقص کا علاج کرتا ہے	۱۲۷
غور و فکر کی ضرورت	۱۲۷

عکس خط حضرت نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بنام مقوقس شاہ مصر

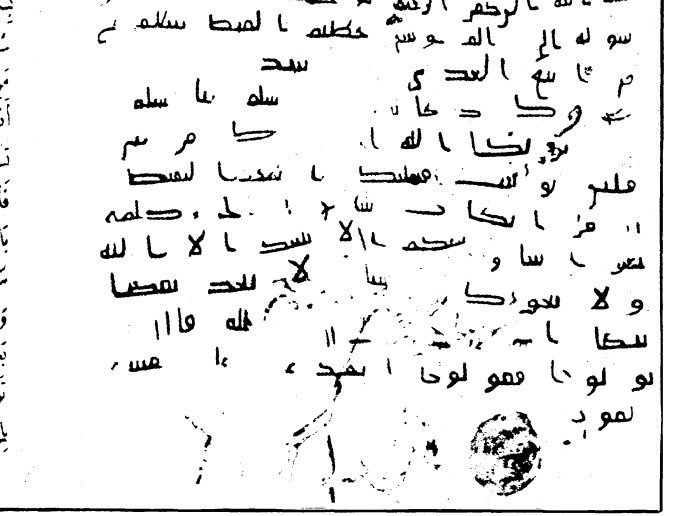

نقل

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ من محمد عبد اللہ ورسولہ الی المقوقس عظیم القبط سلام علی من اتبع الہدی ۔ اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فعلیک اثم القبط یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشہدوا بانا مسلمون

اللہ
رسول
محمد

ترجمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف مقوقس عظیم قبط کی طرف۔ سلامتی ہو اس جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ اما بعد۔ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ مسلمان ہو جا تو محفوظ ہو جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تجھے اس کا دگنا اجر دیگا اور اگر تو پھر گیا۔ تو قبط کا گناہ بھی تجھ پر ہوگا اے اہل کتاب آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے یہ کہ ہم نہ عبادت کریں مگر اللہ کی۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا مالک نہ بنائے۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو تحقیق ہم مسلمان ہیں ۔

اللہ
رسول
محمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید

اس زمانہ میں مخالفین اسلام کے حملوں کو چھوڑ کر خود مسلمانوں نے حدیث کے معاملہ میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ اور اس کے صحیح مقام کو جس پر سلف قایم تھے اور جس کی طرف خود قرآن و حدیث ہم کو ہدایت کرتے ہیں نہیں سمجھا۔ ایک طرف وہ گروہ ہے جس نے حدیث پر اس قدر زور دیا ہے کہ آخر آہستہ آہستہ قرآن شریف چھوٹ گیا۔ پھر کمزور سے کمزور حدیث کی بنا پر اصول دین تک کی پروا نہیں کی جاتی جو صراحت سے قرآن شریف میں مذکور ہیں۔ اور حدیث کو قرآن شریف کے ماتحت کرنے کے خیال کو حدیث کی بے ادبی سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی بروئے درایت یا عقلی طور پر تنقید حدیث کو ایک جرم خیال کیا جاتا ہے۔ اور جو کچھ رطب و یابس کمزور سے کمزور احادیث میں ہے۔ اس کو اصول دین کے برابر وقعت دے کر اس پر اعتراض کرنے والے کو دین اسلام کا منکر یعنی کافر قرار دیا جاتا ہے۔ مقام حدیث کے متعلق اسی غلو کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس زمانہ میں ایک گروہ مسلمانوں کا ایسا پیدا ہو گیا ہے جنہوں نے بالمقابل تفریط کی راہ اختیار کر کے حدیث کی صداقت کا بکلی انکار کر دیا ہے۔ اور خطرناک سے خطرناک حملہ جو کسی دشمن کو کبھی کرنے کی جرأت ہوئی ہو۔ اس سے بہت بڑھ کر حملہ صداقت حدیث پر مسلمانوں کے اس گروہ نے کیا ہے جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت بیباکی سے حدیث کو سرتاپا مجموعہ ہزلیات اور مفتریات قرار دیا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اس لئے مجھ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ برادران اہل اسلام کے لئے اس بارہ

میں صحیح راہ پیش کروں۔ تاکہ جس دین کو ہم دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ خود بھی اس کے اصول صحیحہ سے واقفیت حاصل کریں ⁂

میں نے اس مضمون کو پانچ بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں یہ بتایا ہے کہ صداقت حدیث پر اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے کیا حملے کئے ہیں۔ اور وہ حملے ایک سرسری تاریخی نگاہ سے کس سلوک کے مستحق ہیں۔ باب دوم میں صداقت حدیث پر دو قسم کی خارجی شہادت پیش کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی حفاظت میں اس کے بیان کرنے والوں نے کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے۔ تیسرے باب میں ضرورت حدیث کے مضمون کو بیان کیا ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ قرآن شریف کے ہوتے ہوئے حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ اور کیوں حدیث کو وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چوتھے باب میں جمع حدیث کا مضمون ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ حدیث کی کس طرح حفاظت کی گئی کب اس کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا اور کن مرحلوں میں سے گزر کر یہ تکمیل کو پہنچا۔ پانچویں باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ محدثین نے کس طرح علاوہ تنقید روایت کے بروئے درایت بھی حدیث کی تنقید کی ہے۔ اور اب ہمارے لئے حدیث کی تنقید کے کیا سامان ہیں۔ اور کس حد تک ہم حدیث کو قبول کر سکتے ہیں ⁂

محمد علی

پہلا باب

صداقت حدیث پر اندرونی اور بیرونی حملے

حدیث پر اندرونی اور بیرونی اعتراض

حدیث کی صداقت اور اعتبار پر اس زمانہ میں دو قسم کے حملے ہوئے ہیں۔ ایک بیرونی، اور دوسرے اندرونی۔ بیرونی حملے سر ولیم میور اور سپرنگر وغیرہ عیسائی مستشرقین کی طرف سے ہوئے ہیں اور اندرونی حملے مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی طرف سے اور کسی قدر آزاد خیال لوگوں کی طرف سے ہوئے ہیں بظاہر یہ قیاس ہونا چاہئے تھا کہ اندرونی خیالات کا اثر بیرونی لوگوں پر پڑا ہو۔ مگر یہاں صورت اس کے خلاف ہے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ جہاں بیرونی حملہ آوروں کو ایک حد تک حدیث کی صداقت اور اعتبار کا اعتراف ہے۔ اندرونی حملہ آور سارے عظیم الشان مجموعہ حدیث کو جس کے اندر بہت سا علم دین اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے برگزیدہ اصحاب کے حالات محفوظ ہیں۔ ایک تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ بلکہ تمام کی تمام احادیث اور اس ہر ایک لفظ کو یا فعل کو جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے آپ پر بہتان و افترا قرار دیتے ہیں۔ اس مختصر رسالہ میں دونوں قسم کے ہتراضات کا جواب ہوگا۔

میور کا خیال کہ حدیث جنگوں میں قصہ گوئی سے پیدا ہوئی

سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد (صلعم) میں احادیث کی بحث میں لکھتے ہیں "محمد صلعم کی وفات کے بعد ان کے پیروؤں کا سب سے بڑا شغل جنگ تھا..... لمبی تھکا دینے والی مہمات جنگی کی ثقالت اور ایک جنگ سے دوسری جنگ تک بیکاری کا وقفہ ایک سادہ اور نیم وحشی قوم کے لئے غفلت شعاری کا موجب تھا۔ اسی ثقالت کے دور کرنے کا علاج اور ان وقفوں کا شغل بے تکلف بات چیت یا باقاعدہ گفتگو میں گذشتہ واقعات کی یاد تھی۔ ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ پرجوش گفتگو کا مضمون سوائے اس شخص کے اقوال اور افعال کے اور کیا ہو سکتا تھا جو اس فاتح قوم کے وجود میں آنے کا موجب ہوا تھا اور جس نے ان کے ہاتھ میں اس دنیا اور بہشت دونوں کی کنجیاں دے دی تھیں اس طرح پر محمد

وسلعم) کے پیروؤں کی گفتگو زیادہ تر انہی کے متعلق ہوتی تھی .... یہ وہ مواد تھا جس سے حدیث نے خوب ترقی کی"۔

جنگی شغل والے صحابہ کی حدیث میں روایت

اس مضمون میں میور نے بڑی رنگ آمیزی سے کام لیا ہے مگر اکثر عیسائی مصنفین کی طرح گو اس خیال کی ایجاد میں انہوں نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ اور اس کو خوب سجا کر ایک خوشنما رنگ میں پیش کیا ہے جس سے ایک ناواقف آدمی کو ٹھوکر لگ سکتی ہے لیکن واقعات تاریخی پر ایک سرسری نگاہ میور صاحب کی اس رنگ آمیزی کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی ہے کہ جنگوں کے اندر بے شغلی کے زمانہ میں یہ کہانیاں ایجاد ہوئیں تاکہ نکمے لوگوں کا وقت ان قصہ گوئیوں میں گزر جائے اور بوجھل معلوم نہ ہو۔ حالانکہ جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی روایت میں ان لوگوں کا حصہ عشر عشیر سے بھی بہت کم ہے جن کا تعلق جنگوں سے تھا۔ بلکہ بیشتر حصہ احادیث کا ان صحابہ سے مروی ہے جن کا کام علوم دینی کی اشاعت اور درس وتدریس تھا۔ اور بڑے بڑے فاتحین اور سپاہیوں کی روایات کو اگر کوئی تلاش کرنا چاہے تو بہت ہی کم احادیث ان سے ملیں گی۔ ایک حضرت ابوہریرہ ہی کو لے لو جن سے سب سے زیادہ حدیثیں مروی ہیں ان کا تعلق جنگوں سے کوئی نہ تھا نہ وہ جنگوں میں شامل ہوئے لیکن کل مجموعہ حدیث میں جن کی تعداد بلا تکرار کنز العمال میں بتیس ہزار ۳۲۰۰۰ ہے پانچ ہزار تین سو چوہتر حدیثیں ان سے مروی ہیں یعنی چھٹے حصہ سے بھی زیادہ۔

بخاری میں کثرت روایات علمی اشغال والے صحابہ سے ہے

دوسری طرف حدیث کی سب سے معتبر کتاب لے لو اور دیکھو کہ اس میں ایسی حدیثیں کس قدر ہیں جن کی روایت ان صحابہ تک پہنچتی ہو جو جنگوں میں بہت حصہ لینے والے تھے اور ایسی احادیث کس قدر ہیں جو ان صحابہ تک پہنچتی ہوں جو جنگوں میں شریک نہ ہوتے تھے۔ دونوں قسموں میں سے پانچ چھ بڑے بڑے صحابہ کو لے لو۔ ایک طرف خالد بن ولید۔ ابوعبیدہ۔ ابوسفیان۔ یزید بن ابوسفیان۔ عکرمہ۔ ضرار۔ ابن الازور ہیں۔ اور ان کے مقابل دوسری طرف ابوہریرہ۔ انس بن مالک۔ عبداللہ بن عباس۔ عبداللہ بن عمر۔ عائشہ صدیقہ اور خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اول الذکر گروہ میں سے بخاری میں صرف ایک حدیث ابوسفیان کی آئی ہے۔ اور موخر الذکر گروہ میں سے حضرت ابوہریرہ کی ۴۴۶۔ انس بن مالک ۲۶۸۔ عبداللہ بن عمر ۲۷۰۔ عبداللہ بن عباس ۲۱۷ حضرت عائشہ صدیقہ ۲۴۲۔ دوسری عورتیں ۷۳۔ حضرت عمر ۶۰۔ حضرت علی ۴۹ حضرت ابوبکر ۲۲۔ حضرت عثمان ۹ کل ۱۶۴۳۶ ہیں۔ مقام غور ہے کہ یہ کتنا بڑا جھوٹ میور صاحب نے حدیث پر اعتراض کرنے کیلئے لکھ دیا ہے کہ جنگوں میں شامل ہونے والے لوگ قصہ گوئی کے طور پر حدیثیں بنا لیا کرتے تھے۔ حالانکہ قصہ گوئی اور کہانت یہ وہ دو ہتھیار ہیں جو اسلام کے خلاف اس کے دشمنوں نے استعمال کئے۔ اور اسلام نے ان دونوں کا عرب میں سے خاتمہ کر دیا۔ یہ موقعہ زیادہ تفصیل کا نہیں۔ ہاں اس سے مجھے انکار نہیں کہ جنگوں میں شریک ہونے والے صحابہ سے

بھی احادیث مروی ہیں جو نسبتاً بہت کم ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ کوئی تنخواہ دار سپاہی نہ تھے کہ ساری عمر ہی ان کی جنگوں میں صرف ہوئی ہو بلکہ علمی اشغال بھی رکھتے تھے۔ اور یہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کمال تھا کہ جہاں ان کو فاتح بنایا اور ملک گیری سکھائی ساتھ ہی حکمت اور علم کی چاشنی بھی لگا دی +

مولوی عبداللہ چکڑالوی کے خیالات کہ حدیث سینکڑوں برس بعد بنی

دشمن اگر زیادتی کرے تو اس پر اس قدر الزام نہیں جس قدر اس نادان دوست پر جو اپنے ہاتھ سے اس شاخ کو کاٹتا ہے جس پر وہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ پاک علوم وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اعلےٰ درجہ کے اخلاق۔ وہ پاکیزگی اور طہارت کی باتیں جن سے حدیث بھری پڑی ہے ان کے متعلق "اہل قرآن" کے پیشرو مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کی طرف سے ذیل کا فتویٰ صادر ہوتا ہے +

"فی الحقیقت حدیث میں اس قدر لغویات ہزلیات اور دور از کار اور بے سر و پا باتیں مندرج ہیں کہ وہ اس کی شکل کو نہایت ہی بدنما بناتی ہیں لیکن وضعین احادیث نے یہ بڑی کاریگری کی کہ اس کو خاتم النبیین کی طرف منسوب کر دیا اور اس طرح اس کے بدشکل چہرہ پر سفیدہ مل دیا" برہان الفرقان صفحہ ۱۰۹

"نہ صرف زمانہ محمد رسول اللہ سلام علیہ کے لوگ ہی کتاب اللہ کے مقابلہ میں احادیث انبیاء پیش کرتے تھے۔ بلکہ یہ ملعون کام اس سے بھی پرانا ہے۔ . . . . . فرعون بھی اہل حدیث ہی تھا اور موسیٰ سلام علیہ کے مقابلہ میں یوسف سلام علیہ کی احادیث پیش کرتا تھا۔ اور ان کو ختم المرسلین جانتا تھا" برہان الفرقان صفحہ ۱

"حدیث کی تشریح و تفصیل کتاب اللہ المجید کے سراسر مخالف ہے . . . . . . اس وجہ سے مجھے اس بارہ میں شک ہوا کہ حدیث محمد رسول اللہ سلام علیہ کا قول فعل تقریر نہیں ہے . . . . . . اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک نہایت ہی کریہ النظر بدصورت زشت رو بدشکل مصنوعی چیز ہے۔ اس کو رسول اللہ سلام علیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے آپ کی وفات سے سینکڑوں برس پیچھے بعض خود غرض لوگوں نے از خود یہ ہزلیات گھڑ لیں اور کمال سیاہ دلی سے ان کو ناحق محمد رسول اللہ سلام علیہ کے ذمے لگا دیا ہے۔ یہ کام زیادہ تر بعض یہودی و نصاریٰ دشمنان اسلام کا معلوم ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کی بیخکنی کی یہ بہترین راہ سوچی کہ وہ مسلمانی کے لباس میں لوگوں کو قرآن حکیم کی طرف سے ہٹا کر اور طرف لگا دیں تاکہ ان میں بھی وہی کفریات جاری ہو جائیں جو خود ان کے باطل مذاہب میں موجود تھیں" الزکوٰۃ والصدقات صفحہ ۱۲ و ۱۳ +

"غرضکہ جملہ کتب منزلہ من اللہ میں ہر ایک کتاب خصوصاً قرآن مجید جملہ احکام و تمام مسائل دین اسلام کے بارہ میں مبلح تک بھی ہر طرح کامل مکمل مفصل و مشرح کافی شافی وافی عافی ہوتی ہے۔ ان کے کسی مسئلہ میں اجمال و اشکال نہیں ہوا" مناظرہ صفحہ ۱۸ +

"اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح طور پر بیان ہو گئی ہے تو اب وحی خفی یا حدیث کی کیا حاجت

رہی بلکہ اس کا ماننا اور دین اسلام میں اس پر عملدرآمد کرنا سراسر کفر شرک ظلم فسق ہے .... ماسوائے احسن الحدیث کے یعنی کتاب اللہ المجید کے باقی سب کی سب احادیث دین اسلام کے بارہ میں جو جو مروی ہیں۔ وہ ہر ایک لہو الحدیث میں ہی داخل ہیں۔ محمد رسول اللہ سلام علیہ عموماً جملہ رسل انبیاء سلام علیہم پر محض لوگوں کے افترا و بہتان ہیں" مناظرہ صفحہ ۱۹ و ۲۰ ۔

ان خیالات کا عقلی ابطال

اب اس معترض کے نزدیک حدیث کا کوئی وجود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھا۔ نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کے کوئی اقوال و افعال محفوظ رکھے نہ آگے کسی کو پہنچائے نہ تابعین کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے تاریخی حالات ان کے اقوال و افعال ان کے فتاوے ان کے کارنامے محفوظ رکھیں نہ تبع تابعین کے دل میں ایسا وہم و گمان پیدا ہوا۔ بلکہ پہلی یا دوسری صدی ہجری میں ان باتوں کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے "سینکڑوں برس پیچھے بعض خود غرض لوگوں نے یہ ہزلیات گھڑیں اور کمال سیاہ دلی سے ان کو ناحق محمد رسول اللہ سلام علیہ کے ذمے لگا دیا" شاید اس قول کے قائل سے بڑھ کر نادان دوست اسلام کا کوئی ہی ہوا ہو گا۔ بھلا کون عقلمند اس کو قبول کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے سینکڑوں برس تک آپ کے اقوال کو کسی نے محفوظ نہیں رکھا اور پھر دو تین صدیاں بعد اسلامی ممالک کے ہر گوشے میں جو ہزاروں میلوں میں شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً پھیلے ہوئے ہیں جن کی حد اگر ایک طرف ایشیا میں انتہائے مشرق میں پہنچ چکی ہے تو دوسری طرف یورپ میں انتہائے مغرب پر پہنچ چکی ہے۔ جب مختلف ممالک میں مختلف سلطنتیں قایم ہو چکی ہیں۔ جب شرق کے رہنے والے غرب کے حالات سے ناآشنا اور غرب کے رہنے والے مشرق کے حالات سے ناآشنا ہیں۔ ان عظیم الشان وسیع ممالک میں یکلخت کوئی ایسی ہوا چلتی ہے کہ معاً ہر جگہ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں جو دل سے کچھ اقوال و افعال گھڑ کر اور پھر راویوں کے نام گھڑ کر اور صحابہ کے بھی نام گھڑ کر ہر ایک قول و فعل کے ساتھ ایک سلسلہ روایات قائم کر دیتے ہیں اور اس کو ایسی ترویج دیتے ہیں کہ ایک طرف اگر چین میں یا ایران میں وہ روایت اس سلسلہ اسناد سے مروی ہے تو دوسری طرف ہسپانیہ میں وہی روایت اسی سلسلہ اسناد سے شہرت پا جاتی ہے۔ اور اس زمانہ میں ایک بھی نیک دل انسان ایک بھی خدا ترس مسلمان نہیں رہا جو مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کی طرح یہ آواز اٹھائے کہ اے لوگو خدا کا خوف کرو کل تک ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول و فعل تھا نہ کسی صحابی تابعی یا تبع تابعی کا نام ہم جانتے تھے۔ آج تم نے معاً ہزاروں کی تعداد میں نام اور واقعات گھڑ کر اور اقوال بنا کر ان کو رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اور ایک نئی نماز بنا لی ہے۔ اور زکوٰۃ کے نئے قواعد گھڑ لئے ہیں۔ کیا ایسی سازش پہلے بھی کبھی دنیا پر کسی نے دیکھی یا سنی کہ جس بات

کا نام ونشان تک نہ ہو اس پر فوراً ایک اتنی بڑی عمارت تیار کر کے کسی نامعلوم طریق سے ایک مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی اور کل عالم پر محیط قوم کی روزمرہ کی زندگی میں داخل کر دیا جائے اور سب لوگ باوجود یہ جاننے کے کہ کل تک ہم کو ان باتوں کا علم بھی نہ تھا۔ پھر کروڑوں کی تعداد میں بغیر ایک جگہ اکٹھا ہونے کے اتفاق کر لیں کہ نہیں فی الواقع ہمارا اور ہمارے آباؤ اجداد کا اور ان کے آباؤ اجداد کا بھی عملدرآمد چلا آتا ہے۔ اور تعجب یہ کہ مولوی عبداللہ صاحب تو ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے سینکڑوں برس پیچھے یہ باتیں گھڑی گئیں اور ہم کو دوسری صدی ہجری کی کتنی تصنیفات ملتی ہیں جن میں حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ کی موطا بھی ایک ہے جن میں وہ واقعات لکھے ہوئے موجود ہیں جو ابھی سینکڑوں برس بعد گھڑے جانے تھے۔ اور مولوی صاحب کے فرضی عیسائی یا یہودی کے دماغ میں آنے سے پیشتر وہ حدیثیں ائمہ دین کی لکھی ہوئی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہاں اس خیال کو ایک ہی صورت میں کوئی انسان جس کے سر میں خدا نے وہ گودا رکھا ہے جس سے انسان سمجھ اور فکر کا کام لیتا ہے قبول کر سکتا ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ ساری تاریخ باطل ہے۔ جو کچھ تیرہ سو سال میں لکھا گیا وہ سب جھوٹ۔ اس میں ایک حرف صداقت کا نہیں۔ اور تیرہ سو سال بعد جو خیال مولوی عبداللہ صاحب کے سر میں آ گیا وہی سچ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ خیال جس کو مولوی صاحب نے اس قدر زور شور سے پیش کیا ہے ایسا لچر ہے کہ ایک موٹی سے موٹی عقل کا انسان جس کے اندر ادنیٰ فکر کا مادہ بھی ہو اسے ایک لمحہ کے لئے قبول نہیں کر سکتا۔ اور مولوی صاحب یا ان کے ہمخیالوں کے یہ خیالات

خیالات نادان خلوت نشیں

بہم بر زند عاقبت کفر و دیں۔

کا مصداق ہیں۔ بھلا اگر اتنی بڑی سازش ہو سکتی ہے تو کیا یہ موجودہ قرآن اسی سازش کا نتیجہ نہیں ہو سکتا پھر تو یوں کہنا چاہئے کہ نہ کوئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے نہ کوئی ان پر قرآن اترا نہ کوئی صحابہ ہوئے نہ کوئی اسلامی سلطنت ہوئی۔ یہ سب کچھ نعوذ باللہ عیار لوگوں نے گھڑ کر باتیں بعد میں مشہور کر دیں۔ ہمیں مسلمانوں کے منہ سے یہ باتیں نکلتی ہوئی دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اور پھر اسی عقلمندی کے بھروسے پر اور تاریخ کا اس طرح سے انکار کر دینے پر سمجھا جاتا ہے۔ کہ ہم نے اسلام پر سے کل اعتراضات اٹھا دیئے اور سب دنیا فوراً اب مسلمان ہو جائے گی۔ یاد رکھو کہ حدیث کے اس انکار سے جس کی بنیاد مولوی عبداللہ صاحب نے رکھی ہے کل تاریخ اسلامی کا جس کو دنیا کی بہترین تاریخ ہونے کا فخر ہے انکار لازم آتا ہے۔ اور اس کے انکار کے ساتھ کل تاریخ کا ہی انکار ہے۔ پھر تو کوئی بھی گذشتہ واقعہ درست نہیں۔ اور یہ پیغمبروں کے آنے کے سارے قصے ہی قصے رہ جائیں گے جن کو معلوم نہیں عیار لوگوں نے (نعوذ باللہ من ذالک) کب بنا کر دنیا میں مشہور کر دیا۔

مسلمانوں کے فرزندو کچھ اس عقل سے کام لو جو خدا نے تمہیں دی ہے اور اس باطل خیال کے مردود نتائج پر غور کرو تو تمہارا قلب سلیم ایک لمحہ کے لئے اسے اپنے اندر جگہ نہیں دے سکے گا۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اگر ایک طرف صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کا دامن ان افتراؤں کے بنانے سے پاک ہو بلکہ تبع تابعین کا بھی جیسا کہ مولوی عبداللہ صاحب کے "سینکڑوں برس پیچھے" کے اقرار سے ثابت ہے اور دوسری طرف محدثین کرام پر بھی اس افترا کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ مولوی صاحب نے تسلیم کیا ہے اور دوسری صدی کے اختتام سے پیشتر تبع تابعین کی تصنیفات اب بھی موجود ہیں۔ تو وہ درمیانی زمانہ کونسا ہوا جب یہودیوں اور عیسائیوں نے قرآن سے لوگوں کو ہٹانے کے لئے حدیثیں وضع کیں۔ آخر کوئی نیا خیال جب دنیا میں پیش کیا جائے تو اس کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک یہ کہ خود اس کے اندر کوئی معقولیت ہو دوسرے یہ کہ اس کی تائید اور ذرائع سے ہوتی ہو۔ اب جہاں تک معقولیت کا سوال ہے میں حیران ہوں کہ اتنا عظیم الشان تو انقلاب اس خیال کے ذریعہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حدیث سیرت تاریخ کی تمام کتابیں امام مالک اور ابن اسحاق سے لے کر محض مجموعہ اباطیل ہیں اور اول سے آخر تک جھوٹی روایتوں سے پر ہیں اور پھر اس کے لئے اتنا بھی معقولیت کا سہارا تلاش کرنے سے نہیں ملتا کہ آخر یہ حدیثیں جن کو امام مالک سے شروع کر کے بخاری اور مسلم اور دیگر محدثین نے جمع کیا۔ اور یہ سیرت اور تاریخ کے واقعات جن کو ابن اسحاق سے شروع کر کے بڑے بڑے آئمہ نے اپنی کتابوں میں لکھا۔ ان کے بنائے جانے کا زمانہ کونسا ہے۔ آنحضرت کی وفات سے سینکڑوں برس بعد وہ بنتے ہیں۔ یہ تو مولوی صاحب نے فیصلہ کر دیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو سو سال کے اندر اندر وہ ائمہ کی کتابوں میں مدون ہو کر موجود ہو جاتے ہیں اس پر خود تاریخ شاہد ہے۔ اب آخر کوئی سو دو سو سال کا عرصہ ان کے بننے اور ان کی تشہیر اور ترویج اور ان پر کل اسلامی دنیا کا عملدرآمد کرانے کے لئے بھی چاہیئے۔ افسوس کہ مولوی صاحب نے ایک باطل خیال پیش کر کے بہتوں کو ایک غلط راہ پر تو لا ڈالا لیکن اتنا بھی غور نہ کیا کہ آخر کوئی زمانہ ان احادیث کی وضع کا بھی تو تجویز کرنا چاہیئے۔ بے سروپا بات پر دین کی بنیاد رکھنا عقلمندی کا شیوہ نہیں۔ اور نہ صرف یہ خیال معقولیت کو ہی دھکے دیتا ہے بلکہ دوسری ضرورت کے بھی پورا کرنے سے عاری ہے یعنی اس کی کوئی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اس قدر عظیم الشان مجموعہ افتراؤں کا کبھی تیار ہوا تھا تو کوئی ایک آدھ آواز ہی دنیا کے کسی کنارے سے اٹھتی عرب ایران اور شام سے نہ اٹھی تو چین۔ ترکستان یا جزائر سے ہی اٹھتی۔ افریقہ کے وسیع ممالک یا ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت میں ہی کوئی حق پسند پکار اٹھتا کہ یہ حدیثوں کا مجموعہ تیار ہوا ہے یا جس کے پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے سراسر افترا ہے ہماری نمازیں یہ نہیں جو ان حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں ہماری

زکوٰۃ یہ نہیں جس کا ذکر ان احادیث میں پایا جاتا ہے۔ یہ کام فلاں یہودی یا عیسائی کا ہے جو دین اسلام کو برباد کرنے کے لئے کر رہا ہے مگر یہ کیا ہوا کہ کروڑہا انسانوں میں سے جو ہزارہا میلوں اور بیسیوں ممالک میں پھیلے ہوئے تھے اور الگ الگ زبانیں بولتے تھے۔ ایک شخص کی آواز بھی اس زمانہ میں نہ اٹھی گویا کہ تمام اسلامی دنیا نے سازش کرلی جو ایک ناممکن امر ہے۔ اگر یہ دشمنوں کا کام تھا اور مولوی عبداللہ صاحب کو یہ اعتراف ہے کہ فی الواقع یہ دشمنان اسلام کا کام تھا تو کسی دوست کی آواز ساری دنیا میں ایک کی ہی سہی اس کے خلاف اٹھنی چاہیئے تھی۔ آخر ایک ڈیڑھ سو سال کا عرصہ اتنی حدیثوں کے بننے اور ان کے مسلمانوں کے اندر مروج ہونے میں لگا ہوگا پھر ان پانچ چھ نسلوں میں کروڑ در کروڑ مسلمانوں میں سے کیوں کسی ایک شخص کی آواز بھی نہ اٹھی کہ یہ سب کچھ دشمنوں کا کام ہے۔ مسلمان متنبہ ہو جائیں یا کیا یہ ساری نسلیں بھی اس عرصہ میں سب کی سب بالاتفاق اسلام کی دشمنی پر کمربستہ ہو گئی تھیں اور اسلام کی خیرخواہی کے اکیلے دم بھرنے والے کے لئے یہ مقدر ہوا کہ وہ تیرہ سو سال بعد پیدا ہو کر اندھیرے میں ایک تیر چلا دے جس سے اگر کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے تو خود اسلام کو ہی اور دشمنان اسلام پر اس کے ذریعہ سے کچھ بھی اتمام حجت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ کونسا کچا یا احمق اسلام کا دشمن ہے جو محض اس لئے کہ مولوی عبداللہ صاحب نے تیرہ سو سال بعد آ کر یہ کہہ دیا ہے کہ تاریخ اسلام تمام کی تمام مجموعہ اباطیل ہے اور اس میں ایک بھی قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں۔ نہ کوئی آپ کا فعل ہے۔ آمنا وصدقنا کہہ اٹھے گا۔ اور اس خیال کو طفلانہ قرار دے کر اس پر ہنسی نہیں کرے گا۔

دوسرا باب
صداقت حدیث پر خارجی شہادت

اس باب میں صداقت حدیث کے دو ایسے بینظیر ثبوتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو پرانے واقعات تاریخی کو شاذونادر ہی حاصل ہو سکتے ہیں ٭

مکتوب آنحضرت صلعم بنام مقوقس

ان میں سے پہلا ثبوت وہ ہی ۔ جو اس رسالہ کے ورق اول سے ملتا ہے جس پر ایک پرانے خط کا فوٹو چھپا ہوا ہے ۔ یہ خط وہ ہے جو حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے مقوقس شاہ مصر کو لکھا تھا ۔ اور ایسے ہی چند اور خطوط دوسرے بادشاہوں کو بھی لکھے گئے تھے ۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے یعنی جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ؁ھ ہجری کے آخر میں واپس آئے ۔ تو اُس وقت آپ نے بہت سے گرد و نواح کے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کے لئے دعوتی خطوط لکھے ۔ اور یہ خطوط صحابہؓ لے کر ان بادشاہوں کے پاس گئے ۔ ان خطوط کا ذکر صحیح بخاری اور مسلم میں اور دیگر کتب احادیث میں پایا جاتا ہے ۔ مقوقس شاہ مصر کو جو یہ خط لکھا گیا تھا ۔ اس کا مفصل ذکر مواہب لدنیہ اور دیگر سیرت کی کتابوں میں موجود ہے بلکہ اصل عبارت بھی محفوظ ہے ۔ مواہب لدنیہ میں مندرجہ ذیل ذکر اس خط کے بھیجنے کا اُسی جگہ موجود ہے ۔ جہاں دوسرے بادشاہوں کو خط لکھے جانے کا ذکر ہے ٭

وکتب صلی اللہ علیہ وسلم الی المقوقس ملك مصر والاسکندریۃ واسمہ جریج ابن مینا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد عبد اللہ ورسولہ الی المقوقس عظیم القبط سلام علی من اتبع الھدیٰ اما بعد فانی ادعوك بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یوتك اللہ اجرك مرتین فان تولیت فعلیك اثم القبط یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرك بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون وبعث بہ مع حاطب ابن ابی بلتعۃ فتوجہ الیہ الی مصر بالاسکندریۃ ....
فلما جیٔ بہ الیہ ووقف بین یدیہ ونظر فی الکتاب فضہ وقراہ وقال لحاطب ماکان لہ ان کان نبیاً ان یدعو علی فیسلط علی فقال لہ حاطب وما منع عیسیٰ ان یدعو علی من

خالفہ ان یسلط علیہ فاستعاد منہ الکلام مرتین ثم سکت فقال لہ حاطب انہ قد کان قبلک رجل یزعم انہ الرب الاعلیٰ فاخذہ اللہ نکال الاخرۃ والاولیٰ فانتقم بہ ثم انتقم منہ فاعتبر بغیرک ولا یعتبر غیرک بک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ولعمری ما بشارۃ موسیٰ بعیسیٰ الا کبشارۃ عیسیٰ بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وما دعاءنا ایاک الی القرآن الا کدعائک اھل التوراۃ الی الانجیل ۔ ۔ ۔ ۔ فقال المقوقس انی قد نظرت فی امر ھذا النبی فوجدتہ لا یامر بمزھود فیہ ولا ینھیٰ عن مرغوب فیہ ولم اجدہ بالساحر الضال ولا الکاھن الکاذب ووجدت معہ اٰلۃ النبوۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واخذ کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجعلہ فی حق من عاج ودفعہ لجاریۃ لہٗ اس روایت کو ابن تیمیہ نے بھی اپنی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں بیان کیا ہے ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حاطب ابن ابی بلتعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بنام مقوقس لے کر اس کے پاس اسکندریہ میں پہنچے۔ اور نہ صرف خط ہی اُس کو پہنچایا بلکہ تبلیغ بھی کی۔ اور جب بادشاہ نے یہ اعتراض کیا کہ اگر آنحضرت خدا کے نبی ہیں تو وہ کیوں دعا کر کے مجھ پر مسلّط نہیں ہو جاتے۔ تو حاطبؓ نے ایسا معقول جواب دیا جس سے بادشاہ شرمندہ ہو گیا یعنی یہ کہ اگر سنت اللہ انبیاءؑ کے متعلق یہی ہوا کرتی ہو کہ وہ بجائے دین حق کی طرف دعوت کرنے کے مخالفین پر بددعا کر کے اُن کو مغلوب کر لیا کریں تو حضرت عیسٰی نے کیوں ایسا نہ کیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس خط کو مقوقس نے نہایت حفاظت سے ڈبیہ میں بند کیا اور ایک لونڈی کے سپرد کیا۔ اور دوسری روایت میں ہے۔ کہ مہر لگا کر اپنے خزانچی کے سپرد کیا۔

اصل خط کی دریافت مقوقس کے نام کا خط ۱۸۵۸ء میں مصر کی ایک خانقاہ میں جو عیسائیوں کی ہے بعض فرانسیسی سیاحوں کو مل گیا۔ اور اب اصل خط قسطنطنیہ میں محفوظ ہے۔ اور بڑے بڑے عیسائی محققین نے اسے اصلی قرار دیا ہے منجملہ ان کے ڈاکٹر بیچر ہے۔ اور خود اُس کے اصلی ہونے کی یہ کچھ کم شہادت نہیں کہ وہ عیسائی خانقاہ میں عیسائیوں کے ہی ہاتھ لگا۔ اب ہم اس اصلی خط کی عبارت کا اُس عبارت سے مقابلہ کرتے ہیں جو احادیث میں موجود ہے۔ تا یہ معلوم ہو کہ احادیث نے اصل واقعات اور اصل الفاظ کو کہاں تک محفوظ رکھا ہے اس غرض کے لئے دو کالموں میں یہ دونوں عبارتیں درج کی جاتی ہیں۔ تا ناظرین آسانی سے مقابلہ کر سکیں دائیں طرف کے کالم میں اصل خط کی عبارت کی نقل ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر بیچر نے اُسے پُرانی رسم الخط سے نئی رسم الخط

میں دکھایا ہے اور بائیں کالم میں حدیث کے الفاظ ہیں جو مواہب لدنیہ کی روایت سے لئے گئے ہیں جس کا حوالہ اوپر بھی دیا گیا ہے +

الفاظ حدیث بسم اللہ الرحمن الرحیم	بسم اللہ الرحمن الرحیم ط
اور عکس کا نقل من محمد عبد اللہ ورسولہ الی	من محمد عبد اللہ ورسولہ الی المقوقس
المقوقس عظیم القبط سلام علی من اتبع الھدٰی	عظیم القبط سلام علی من اتبع الھدی
اما بعد فانی ادعوک بدعایة الاسلام اسلم	اما بعد فانی ادعوک بداعیة الاسلام
تسلم یوتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت	اسلم تسلم یوتک اللہ اجرک مرتین
فعلیک اثم القبط یا اھل الکتاب تعالوا الی	فان تولیت فعلیک اثم القبط یا اھل
کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک	الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد
بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون	الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا
اللہ فان تولوا فقولوا اشہدوا بانا مسلمون	اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون

نوٹ معتبر احادیث میں اس نقش کی مہر بنوائے جانے اور تمام خطوط پر جو بادشاہوں کو بھیجے گئے تھے لگائے جانے کی خبر صحیح موجود ہے +

اب مذکورہ بالا عبارتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں مطلق کوئی فرق نہیں سوائے لفظ داعیہ اور دعایہ کے جن کا مفہوم واحد ہے جہاں تک اصل خط کو دیکھا جاتا ہے داعیہ پڑھنے والے کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور خط میں اصل لفظ دعایہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اس فرق کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت روایت اور اصل خط میں ایک حیرت انگیز لفظی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور راویوں نے یہاں تک بھی تصرف نہیں کیا کہ اسی مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ادا کر دیا ہو +

حیرت انگیز مطابقت اور اس سے نتائج

اس خط کے دریافت ہونے سے کئی باتیں وضاحت سے ثابت ہوتی ہیں سب سے اول تو ان تمام احادیث کی صداقت پر مہر لگ گئی جن میں بادشاہوں کے نام خطوط لکھے جانے کا ذکر ہے پھر یہ بھی یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ کہ جو تفصیلات ان احادیث میں آنحضرت کے قاصدوں اور خطوط کے ساتھ سلوک کے متعلق درج ہیں۔ وہ بھی سب بالکل درست اور صحیح ہیں۔ کیونکہ جب ایک خط کی تفصیلات جن میں سے اس کا حفاظت سے رکھا

جاتا بھی ہے۔ اس قدر صفائی سے ثابت ہوگئیں۔ تو دوسری تفصیلات پر بھی جن کو معتبر احادیث میں بیان کیا گیا ہے کوئی جرح نہیں ہو سکتی۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز امر خط کی عبارت کا حدیث کی عبارت سے ملنا ہے۔ ایسی مطابقت کہ ایک لفظ کا بھی فرق نہیں ہے۔ کیا یہ جائے تعجب نہیں کہ ایک خاصے لمبے خط کی عبارت کو نقل کرنے میں ایک لفظ کا بھی فرق نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے راوی اصل الفاظ کے پہنچانے میں کس قدر محتاط تھے پس جب انہوں نے ایک خط کے الفاظ کو ایسی محنت سے روایت اور نقل کیا۔ تو ان الفاظ کے متعلق۔ جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلتے سنتے تھے اور جن میں مسائل دینی بیان ہوتے تھے۔ کیوں اور بھی زیادہ محتاط نہ ہوں گے ؎

آنحضرت صلعم کی مہر | اس اصل خط میں جو دریافت ہوا ہے۔ ایک بات اور نہایت ہی قابل توجہ ہے۔ خط کے آخر پر ایک مہر ہے جس پر نقش محمد رسول اللہ ہے اب اس مہر کی نسبت تمام معتبر احادیث میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور صرف مہر کے متعلق ہی نہیں بلکہ مہر کے نقش اور اس کی دوسری تفصیلات کے متعلق بھی مہر کے متعلق متواتر روایات آئی ہیں چنانچہ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مختلف روایتوں سے بیان کی گئی ہے ؎

پہلے باب دعاء النبی الی الاسلام میں ہے عن قتادۃ قال سمعت انسا رضی اللہ عنہ یقول لما اراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یکتب الی الروم قیل لہ انھم لا یقرؤن کتابا الا ان یکون مختوما فاتخذ خاتما من فضۃ فکانی انظر الی بیاضہ ونقش فیہ محمد رسول اللہ

اور دوسری جگہ کتاب اللباس میں یہ حدیث ان الفاظ میں موجود ہے عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اراد ان یکتب الی رھط او اناس من الاعاجم فقیل لہ انھم لا یقبلون کتابا الا علیہ خاتم فاتخذ النبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتما من فضۃ نقشہ محمد رسول اللہ فکانی بوبیص او ببصیص الخاتم فی اصبع النبی صلی اللہ علیہ وسلم او فی کفہ اور اس باب میں پھر حدیث خاتم کو ذکر کیا ہے عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال اتخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتما من ورق وکان فی یدہ ثم کان بعد فی ید ابی بکر ثم کان بعد فی ید عمر ثم کان بعد فی ید عثمان حتی وقع بعد فی بئر اریس نقشہ محمد رسول اللہ یہ حدیث انس بن مالک کی روایت سے ان الفاظ میں

علیہ وسلم ان یکتب الی الروم قیل لہٗ انھم لن یقرؤا کتابک اذا لم یکن مختوماً فاتخذ خاتماً من فضۃ ونقشہ محمد رسول اللہ کانی انظر الی بیاضہ فی یدہ۔ ایسا ہی دوسری کتب صحاح میں بھی یہ حدیث موجود ہے یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم کو یا عجم کے بادشاہوں کو خطوط لکھنے کا ارادہ کیا تو صحابہ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ وہ کوئی خط کو نہیں پڑھتے۔ سوائے اس کے کہ اُس پر مرسل کی مُہر ہو چنانچہ آپنے ایک مُہر چاندی کی تیار کرائی جس پر محمد رسول اللہ نقش کرایا۔ اور اس سے خطوط پر مُہر لگائی۔ پھر یہ مہر آنحضرتؐ کی زندگی میں آپ کے ہاتھ میں رہی۔ اور آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں اور حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت عمر کے ہاتھ میں اور حضرت عمر کی وفات کے بعد حضرت عثمان کے ہاتھ میں اور پھر خلیفہ ثالث سے یہ مہر ایک کنوئیں میں گر پڑی جس کا نام اریس ہے۔ اور پھر نہیں ملی۔ غرضیکہ بتواتر روایات سے مہر کا اس موقعہ پر بنوایا جانا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہی صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کا نقش محمد رسول اللہ تھا۔ اب مقوقس کے اصل خط کے دریافت ہونے نے ان تمام احادیث کی صداقت کو اظہر من الشمس کر دیا ہے۔ کیونکہ اُس سے ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ واقعی خطوط پر مُہر لگانے کے لئے ہی یہ مُہر تیار کی گئی تھی۔ کیونکہ اُن ہی خطوط میں سے جن کا ذکر حدیث میں ہے ایک خط پر یہ مُہر موجود ہے۔ اور اس کا نقش بھی وہی ہے۔ جو احادیث میں بیان کیا گیا ہے +

مہر کا نقش مطابق حدیث اور اس کا عکس سے مقابلہ

مگر احادیث سے اس سے زیادہ تفصیلات اس مہر کے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں یہ حدیث انس کی روایت سے موجود ہے

عن انس ان ابابکر رضی اللہ عنہ لما استخلف کتب لہٗ فکان نقش الخاتم ثلثۃ اسطر محمد سطر ورسول سطر واللہ سطر وذادنی احمد حدثنا الانصاری قال حدثنی ثمامۃ عن انس قال کان خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی یدہ وفی ید ابی بکر فلما کان عثمان جلس علی بئر اریس یعبث بہ فسقط قال فاختلفنا ثلثۃ ایام مع عثمان

حضرت انس فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو آپ کے پاس تھے یعنی زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق اور مہر کا نقش تین سطروں میں رسول ایک سطر اور اللہ ایک سطر اور اس روایت زیادہ ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مہر آپ کے

دست مبارک میں رہی - پھر آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں پھر اُن کے بعد حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں پھر اُن کے بعد حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں پھر جب ایک دن حضرت عثمان چاہ اریس پر بیٹھے تھے تو آپ نے انگوٹھی نکالی اور اُسکو ہاتھ میں پھیرنے اور اِدھر اُدھر کرنے لگے تو وہ گر گئی پھر تین دن تک ہم حضرت عثمانؓ کے ساتھ اُس انگوٹھی کی تلاش میں لگے رہے لیکن انگوٹھی نہ ملی اب اس حدیث سے یہ ایک اور بات معلوم ہوئی کہ انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ ایک خاص طرز پر لکھا ہوا تھا - اور تینوں لفظ الگ الگ سطروں میں تھے - اور یہ انگوٹھی جیسا کہ بہت سی آیات معلوم ہوتا ہے - وہی تھی - جو بادشاہوں کے نام خطوں پر مہر لگانے کے لئے تیار کرائی گئی تھی - فتح الباری میں اس حدیث کے نیچے بعض شیوخ کے اس قول کو نقل کیا ہے ان کتابتہ کانت من اسفل الی فوق یعنی ان الجلالۃ فی اعلی الاسطر الثلاثۃ ومحمد فی اسفلہا یعنی مہر کی کتابت کی جو تین سطریں بیان کی گئی ہیں - اُن کی ترتیب نیچے سے اوپر کو تھی یعنی اللہ کا نام سب سے اوپر کی سطر میں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے نیچے کی سطر میں - اس قول کی تضعیف کی گئی ہے - مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول کسی حدیث پر مبنی تھا - جو ملی نہیں - مگر اب اصل خط کے دریافت ہونے نے اس قول کی تصدیق کر کے اس کو صحیح ثابت کر دیا پس اب اگر ہم احادیث کی روایتوں کی بنا پر مُہر کو تجویز کرتے " تو اُس کا نقش بعینہ وہی تجویز کرتے جو اب دریافت ہوا ہے یعنی

اب اس بےنظیر شہادت پر غور کرو جس سے احادیث اسلامی کی صداقت پہلے سے بھی بڑھ کر چمک اُٹھی ہے - ایک پرانی تحریر کے دستیاب ہونے سے اگر احادیث کا اس سے اختلاف ہوتا - تو حدیث پر بڑا بھاری حملہ تھا - اور احادیث کی صداقت معرض خطر میں تھی - مگر یہی تحریر احادیث کی صداقت پر ایک عظیم الشان گواہ ہو گئی - اور نہ صرف اُن تمام احادیث کی صداقت ہی اس سے ثابت ہوئی جن میں بادشاہوں کے نام خطوط کا لکھا جانا اور مہر کا بنوانا اور اُن خطوط پر لگایا جانا مذکور ہے - بلکہ اس واقعہ سے عام طور پر احادیث کی صداقت پر مُہر لگ گئی - کہ کس قدر سچائی سے صحابہؓ نے واقعات کے بیان کرنے میں کام لیا ہے +

احادیث میں پیشگوئیاں

غرضکہ مقوقس والا خط ایک بےنظیر شہادت احادیث کی صداقت پر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - مگر اس شہادت کے علاوہ میں احادیث کی صداقت پر ایک اور بےنظیر شہادت اس باب میں پیش کرنی چاہتا ہوں - یہ شہادت نہ صرف احادیث کی صداقت پر ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کا منجانب اللہ ہونا ثابت کرتی ہے - یہ ہے احادیث

میں پیش گوئیوں کا موجود ہونا اگر اسلام کی تاریخ کو ہم تین زمانوں پر تقسیم کریں۔ یعنی ابتدائی زمانہ درمیانی زمانہ۔ اور آخری یا موجودہ زمانہ تو ان تینوں میں ہم اُن پیشگوئیوں کا ظہور کھلا کھلا پاتے ہیں۔ جو احادیث میں مذکور ہیں۔ اور جن سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہر زمانہ میں اپنی چمک دکھاتی ہے۔ اور آپ کی برکات کا ہر زمانہ میں جاری رہنا ثابت ہوتا ہے۔ کفار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کے غالب آنے کی پیش گوئیاں کھلے کھلے الفاظ میں قرآن کریم کی مکی سورتوں میں موجود ہیں۔ مگر اس جگہ میرا منشاء صرف اُن پیشگوئیوں کے بیان کرنے کا ہے۔ جو احادیث میں ہیں۔ ایسی پیشگوئیاں کثرت ہیں۔ مگر نمونہ کے طور پر صرف ایک دو اُن میں سے میں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً حدیث میں یہ پیشگوئی موجود ہے۔ کہ صحابہؓ شام اور ایران کو فتح کریں گے

شام و ایران کی فتح کی پیشگوئی

یہ پیش گوئی اس وقت کی ہے جب جنگ احزاب کے وقت خندق کھودی جا رہی تھی۔ احمد نسائی بیہقی۔ طبرانی نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ اصل حدیث یہ ہے جس کے اول راوی براء بن عازب صحابی ہیں۔ قال لما کان حین امرنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بحفر الخندق عرضت لنا فی بعض الخندق صخرۃ لا تأخذ فیہا المعاول فاشتکینا ذالک الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجاء فاخذ المعول فقال بسم اللہ فضرب ضربۃ فکسر ثلثہا وقال اللہ اکبر اعطیت مفاتیح الشام واللہ انی لابصر قصورہا الحمر الساعۃ ثم ضرب الثانیۃ فقطع الثلث الاخر فقال اللہ اکبر اعطیت مفاتیح فارس واللہ انی لابصر قصر المدائن ابیض ثم ضرب الثالثۃ وقال بسم اللہ فقطع بقیۃ الحجر فقال اللہ اکبر اعطیت مفاتیح الیمن واللہ انی لابصر ابواب صنعاء من مکانی ھذا الساعۃ ..... اور بعض روایتوں میں آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں فضرح المسلمون واستبشروا۔ یعنی خندق میں ایک پتھر کو توڑتے وقت آپ نے یہ فرمایا کہ مجھے شام کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ اور میں اس کے سرخ محلوں کو اس وقت دیکھ رہا ہوں۔ اور پھر فرمایا کہ مجھے فارس کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ اور میں اس جگہ سے اس کے سفید محلوں کو دیکھ رہا ہوں اور ایسا ہی یمن کے متعلق فرمایا کہ اس کی کنجیاں مجھ کو دی گئی ہیں۔ اور یہ اس حال میں فرمایا جب آپ ایک پتھر کو توڑ رہے تھے۔ آپ نے اس پتھر کو تین ضربوں میں توڑا اور ہر ایک ضرب کے بعد ایک پیشگوئی کی۔ گویا اس پتھر کا توڑنا بطور ایک فال کے تھا۔ کہ یہ سلطنتیں آپ کے صحابہؓ کے آگے اسی طرح ٹوٹ جائیں گی ✦

احادیث کی وہ پیشگوئیاں جو کتب حدیث کی اشاعت کے بعد پوری ہوئیں

لیکن علاوہ اس کے ایک اور ثبوت بھی یہ احادیث اپنی صداقت کا رکھتی ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ایسی ہی پیشگوئیاں درمیانی زمانہ کے متعلق بھی پائی جاتی ہیں۔ اور وہ قطعی ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہونے کا اپنے اندر رکھتی ہیں اس طرح پر کہ حدیث کی اکثر کتابیں جن میں پیشگوئیاں درج ہیں۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اکٹھی ہو کر دنیا میں شائع ہو چکی تھیں۔ اور درسوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اور لاکھوں انسان اُن کا مطالعہ کرتے تھے۔ اب اُنہیں کتابوں میں ہم وہ حدیثیں پاتے ہیں جن میں ایسی پیشگوئیاں مذکور ہیں۔ جو صدہا سال بعد پوری ہوئیں۔ اور بسبب اس کے کہ یہ کثرت سے لوگوں کے درمیان شائع ہو چکی تھیں۔ ان کے پورا ہونے پر اہل علم نے ان واقعات کو لکھا اور خدا کا کلام پورا ہونے پر خوشی ظاہر کی۔ اس طرح پر یہ احادیث نہ صرف اپنی صداقت کا ثبوت ہی اپنے اندر رکھتی ہیں۔ بلکہ اُن دوسری احادیث کی صداقت پر بھی شاہد ہیں جن میں وہ پیشگوئیاں موجود ہیں جو جمع احادیث سے پہلے زمانہ میں پوری ہو چکی تھیں +

فتح قسطنطنیہ کی پیشگوئی

سنن ابوداؤد اور صحاح ستہ کی بعض دوسری کتابوں میں ایسی احادیث موجود ہیں جن میں کھلے کھلے لفظوں میں فتح قسطنطنیہ کی پیش گوئیاں موجود ہیں۔ گویا یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ میں آنے کے بعد پھر نکل جائے گا۔ اب جس وقت ان احادیث کو اُن کتابوں میں لکھا گیا۔ اُس وقت قسطنطنیہ عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اور مسلمانوں کی دو یا اڑھائی سو سال کی فتوحات کے باوجود قسطنطنیہ اُن کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اور نہ کوئی قرائن ایسے موجود تھے۔ کہ مسلمان اس شہر کو فتح کریں گے۔ مگر محدثین کو کبھی ان باتوں کا خیال نہ تھا بلکہ وہ صرف یہ دیکھ لیتے تھے۔ کہ حدیث کی صحت ثابت ہے یا نہیں جن احادیث کی صحت اُن کے نزدیک پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ اُنہیں قبول کر لیتے تھے۔ خواہ اُن میں ایسی پیشگوئیاں ہوں جو پوری ہو چکی ہوں اور خواہ ایسی ہوں جو ابھی آئندہ زمانہ کے متعلق ہوں۔ اب یہ پیشگوئیاں قسطنطنیہ کے متعلق ابتدا سے مسلمانوں کے درمیان شہرت یافتہ تھیں۔ اور پھر دوسری تیسری صدی ہجری میں کتابوں میں لکھی جا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئیں۔ چنانچہ اُن کے لکھا جانے کے قریباً پانچ سو سال بعد ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا ایسے زمانہ میں جبکہ پیش گوئی کے شائع ہوئے پر آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ پس یہ قدر صریح ثبوت ہے۔ نہ صرف اس امر کا کہ یہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلی ہوئی ہیں۔ بلکہ آنحضرتؐ کی صداقت

+ پیشگوئی کا دوسرا حصہ اس زمانہ میں پورا ہوا ہے۔ منہ

پر بھی یہ پیشگوئیاں بیّن گواہ ہیں۔ ایسا ہی انہیں کتب یعنی ابوداؤد وغیرہ میں ایسی احادیث موجود ہیں جن میں یہ پیشگوئیاں ہیں۔ کہ مسلمان ترکوں کے ہاتھ سے سخت ہزیمت اٹھائیں گے۔ اور قتل کیے جائیں گے۔ یہ پیشگوئی بھی صدہا سال بعد پوری ہوئی۔ جب ترکوں نے بغداد کو تباہ کیا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا اور اپنی طرف سے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ ساتویں صدی ہجری کا ہے۔ جب ان پیشگوئیوں کو کتابوں میں لکھے ہوئے چار سو سال کے قریب گزر چکے تھے۔ چنانچہ جن لوگوں نے ان احادیث کی شرح لکھی ہے۔ انہوں نے ان تمام واقعات کو جو ان پیشگوئیوں کو پورا کرنے والے ہیں پورے بسط سے ان احادیث کے نیچے لکھا ہے۔ اور ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعجاز کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ ایسا ہی عیسائیوں کا تھوڑے عرصہ کے لئے مسلمانوں پر غالب آکر بیت المقدس پر قبضہ کر لینا اور مسلمانوں کا پھر دوبارہ ان سے بیت المقدس لے لینا۔ ان سب واقعات کے متعلق ان ہی کتابوں میں پیشگوئیاں لکھی گئیں۔ اور آخر مدت بعد پوری ہو کر لاکھوں انسانوں کے ازدیاد ایمان کا موجب ہوئیں +

خروج نار کی پیشگوئی اسی زمانہ کے متعلق ایک اور مثال میں بیان کرنی چاہتا ہوں صحیح بخاری میں جو بہر حال امام بخاری علیہ الرحمۃ کی وفات سے (جو ۲۵۶ھ ہجری میں واقع ہوئی) پہلے شائع ہو چکی تھی۔ باب خروج النار کے نیچے یہ حدیث ابوہریرہ کی روایت سے درج ہے۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقوم الساعۃ حتی تخرج نار من ارض الحجاز تضیئی اعناق الابل ببصریٰ یعنی ضروری ہے کہ قبل از قیامت ارض حجاز سے ایک آگ نکلے جو بصریٰ میں اعناق الابل یعنی ٹیلوں اور پہاڑیوں کو روشن کر دے۔ یہی حدیث صحیح مسلم میں بھی درج ہے اور اس میں یہ کھلی کھلی پیشگوئی ہے کہ ارض حجاز سے کوئی عظیم الشان آگ نکلے گی جس کی روشنی بصرے کی پہاڑیوں تک پہنچے۔ یہ پیشگوئی تیسری جمادی الآخر ۶۵۴ھ ہجری کو پوری ہوئی۔ چنانچہ فتح الباری میں اس آگ کے نکلنے کا حسب ذیل ذکر لکھا ہے:-

قال القرطبی فی التذکرۃ قد خرجت نار بالحجاز بالمدینۃ وکان بدؤھا زلزلۃ عظیمۃ فی لیلۃ الاربعاء بعد العتمۃ الثالث من جمادی الآخرۃ سنۃ اربع وخمسین وستمائۃ واستمرت الی ضحی النہار یوم الجمعۃ فسکنت وظہرت النار بقریظۃ بطرف الحرۃ تری فی صورۃ البلد العظیم علیہا سور محیط علیہ شراریف وابراج ومآذن وتری رجال

يقودونها الى ثم على جبل الاذكته واذابته ويخرج من مجموع ذالك مثل النهر احمر وازرق له دوي كدوي الرعد ياخذ الصخور بين يديه وينتهي الى محط الركب العراقي واجتمع من ذالك ردم صار كالجبل العظيم فانتهت النار الى قرب المدينة ومع ذالك فكان ياتي المدينة نسيم بارد وشوهد لهذه النار غليان كغليان البحر وقال لي بعض اصحابنا رايتها صاعدة في الهواء من نحو خمسة ايام وسمعت انها رويت من مكة ومن جبال بصرى وقال النووي تواتر العلم بخروج هذه النار عند جميع اهل الشام۔ گویا اس آگ کا نکلنا ایک ایسا مشہور واقعہ تھا کہ سب اہل علم نے اس پیشگوئی کے پورا ہونے کو محسوس کیا۔ جو صحیح بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہے۔ مطلب عربی عبارت مذکورہ بالا کا یہ ہے۔ کہ قرطبی نے تذکرہ میں اس بات کو بیان کیا ہے۔ کہ حجاز میں ایک آگ نکلی۔ اور اس سے پہلے ایک بڑا بھاری زلزلہ آیا۔ اور یہ واقعہ تیسری جمادی الثانی ۶۵۴ھ ہجری بعد عشا کا ہے۔ اور یہ آگ برابر جلتی رہی۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن چاشت کے وقت آ کر ٹھہری۔ اور دور سے یہ آگ ایک بڑے شہر کی طرح نظر آتی تھی جس کے گرد فصیلیں ہوں اور اُن پر برج وغیرہ ہوں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ آدمی اس آگ کو جلا رہے ہیں جس پہاڑ پر یہ آگ گزرتی تھی۔ اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھی۔ اور پگھلا دیتی تھی۔ اور اس سے ایک نہر نکلتی تھی سُرخ اور نیلگوں رنگ کی آواز اس کی ایسی تھی جیسے بادل کے گرجنے کی آواز۔ اور پتھروں کو ساتھ بہالئے لیئے جاتی تھی۔ اور اس جگہ پر آ کر ٹھہری جو قافلہ عراق کے اُترنے کی جگہ ہے۔ اور اس سے ایک روک ایک بڑے پہاڑ کی مانند بن گئی۔ اور آگ مدینہ کے قرب وجوار تک پہنچ گئی مگر باوجود اس کے مدینہ میں ٹھنڈی ہوا آتی رہی۔ اور اُس آگ میں ایک جوش اور طوفان نظر آتا تھا جیسا سمندر میں طوفان آتا ہے۔ اور دیکھنے والوں نے بیان کیا۔ کہ قریباً پانچ دن یہ آگ ہوا میں چڑھی ہوئی دیکھی گئی۔ اور یہ بھی میں نے سُنا ہے۔ کہ یہ آگ مکہ اور بصرے کے پہاڑوں سے نظر آتی تھی۔ اور نووی کہتا ہے۔ کہ کل اہل شام کے نزدیک اس آگ کے علم کا تواتر پایا جاتا ہے۔

اب ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے پر غور کرو ان واقعات کو اُن پیش گوئیوں پر آج ہی نہیں لگایا جاتا بلکہ جس وقت یہ واقعات ظاہر ہوئے۔ اُس وقت اہل علم نے ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے پر خوشی ظاہر کی۔ کیونکہ یہ پیش گوئیاں کوئی پوشیدہ امر نہ تھیں۔ بلکہ لاکھوں انسانوں

ہیں مشہور اور سینکڑوں کتابوں میں لکھی جا چکی تھیں۔ اور اسی لئے نار حجاز کے نکلنے اور دوسری بعض پیشگوئیوں کو ان شارحین حدیث نے جن کے زمانے سے پہلے یہ واقعات ہو چکے تھے۔ مفصل طور پر اپنی کتابوں میں بیان کیا۔ اس سے بڑھ کر صداقت احادیث کا اور کیا ثبوت طلب کیا جا سکتا ہے+

ترکوں سے مسلمانوں پر تباہی آنے کی پیشگوئی

اب اِن پیشگوئیوں کی حقیقت پر غور کرو۔ ترکوں کے ہاتھ سے جو مسلمانوں پر تباہی آنے والی تھی۔ اُس کی کیسی صریح الفاظ میں مخبر صادق علیہ السلام نے خبر دی ہے۔ نہ صرف ترک کا نام لے کر ہی سمجھایا۔ بلکہ یوں بھی بیان فرمایا قال لا تقوم الساعۃ حتی تقاتلوا قوماً نعالهم الشعر وحتی تقاتلوا الترک صغار الاعین حمر الوجوہ ذلف الانوف کان وجوههم المجان المطرقة۔ صحابہؓ کے درمیان یہ پیشگوئی بہت شہرت پا چکی تھی۔ کیونکہ اُن کو یہ خبر دی گئی تھی کہ اُترکوا الترک ما ترکوکم۔ جب تک ترک تم کو کچھ نہ کہیں۔ تم بھی اُنہیں مت چھیڑو کیونکہ مسلمانوں پر ترکوں کے ہاتھ سے تباہی آنے والی ہے چنانچہ حضرت معاویہ کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے۔ کہ معاویہ بن خدیج کہتا ہے۔ کہ میں معاویہؓ کے پاس تھا۔ تو اس کے پاس اُس کے ایک عامل کا خط آیا۔ کہ ترکوں سے اُس کا مقابلہ ہوا۔ اور اُس نے ترکوں کو بھگا دیا۔ اس پر معاویہؓ بہت غضبناک ہوا۔ اور اُس عامل کو لکھا۔ کہ جب تک میں تم کو نہ لکھوں اُن سے جنگ مت کرو۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ترک عربوں کو نکال دیں گے۔ یہاں تک کہ اُن کو شیح (گھاس) کے اُگنے کی جگہ تک پہنچا دیں گے یعنی شہروں سے نکال کر جنگلوں میں داخل کر دیں گے جس سے اشارہ عظیم الشان تباہی کی طرف ہے۔ اور معاویہؓ نے لکھا کہ اسی وجہ سے میں ترکوں کے ساتھ جنگ کرنے کو ناپسند کرتا ہوں۔ اور آخر جب مسلمانوں نے مخبر صادق کے حکم اُترکوا الترک کی خلاف ورزی کی۔ اور خوارزم شاہ نے چنگیز خاں کے ایلچیوں کو قتل کر ڈالا۔ تو پھر وہ تباہی مسلمانوں پر آئی جس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی طبرانی نے یہ حدیث بیان کی ہے ان بنی قنطوراء اول من سلب امتی ملکهم یعنی ترک ہی اول وہ لوگ ہوں گے جو میری اُمت سے ملک چھین لیں گے۔ بغرضکہ صحابہؓ کے اندر یہ ایک نہایت ہی شہرت یافتہ امر تھا۔ کہ ترکوں کے ہاتھ سے مسلمانوں پر خطرناک تباہی آئے گی۔ اور یہ پیشگوئیاں صحاح ستہ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں اور ان کے لکھا جانے کے صدہا سال بعد

یہ پیش گوئیاں نہایت صفائی اور وضاحت سے پوری ہوئیں۔ الغرض یہ پیش گوئیاں جو اسلام کے درمیانی زمانہ میں پوری ہوئیں۔ مدتوں پہلے احادیث کی کتابوں میں لکھی جا چکی تھیں۔ اور اس طرح پر یہ احادیث کی صداقت پر ایک عظیم الشان گواہ ہیں ✦

آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں مگر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیاں اسلام کے ابتدائی یا درمیانی زمانوں تک ہی محدود نہیں رہیں۔ بلکہ اس آخری زمانہ میں بھی وہ اسی صفائی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منجانب اللہ ہونے کی شہادت ادا کر رہی ہیں۔ کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ اس زمانہ کا نقشہ احادیث میں نہایت صفائی سے کھینچا ہوا موجود ہے۔ دین صلیبی کا اطراف عالم میں پھیل جانا اور اس کا دنیا پر غالب ہو جانا۔ اس کے حامیوں کا مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے ہر قسم کے سامان دنیوی کا پیش کرنا۔ اس کے ساتھ عالم میں عیش و عشرت کا ترقی کر جانا۔ اور سیم و زر کی افراط مسلمانوں کا قرآن کو چھوڑ دینا۔ اسلام کا پھر حالت غربت کی طرف عود کر آنا۔ مسلمانوں پر اس قدر فتن کا ہجوم کرنا کہ وہ ایک طرف سے نکلیں تو دوسری طرف مبتلا ہو جائیں۔ دنیا میں اُن قوموں کا پیدا ہو جانا جن کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت کسی کو نہ ہوگی اور اُن کا عالم پر محیط ہو جانا۔ آخر عیسائیت کا خود بخود کمزور ہو کر اُس کے عقاید کی غلطی کا دنیا پر ظاہر ہو جانا اور اس طرح پگھل جانا جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتا ہے اور دین اسلام کا براہین کے ساتھ غالب آکر آفتاب صداقت خیر البشر کا مغرب سے طلوع کرنا وغیرہ یہ تمام امور احادیث میں بالصراحت موجود ہیں۔ مگر یہ مضمون اس قدر بسط کو چاہتا ہے کہ اس کے لئے علیحدہ رسالہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں اسے کسی دوسرے وقت پر چھوڑ کر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں ✦

تیسرا باب

ضرورت حدیث

فہم قرآن میں ہم حدیث کے محتاج ہیں

سب سے پہلا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے یہ ہے۔ کہ آیا فی الواقع ہمیں حدیث کی کچھ ضرورت ہے؟ جن لوگوں نے اس زمانہ میں انکار حدیث کیا ہے اس کی بڑی وجہ وہی بتاتے ہیں کہ ہمیں حدیث کی کچھ ضرورت نہیں اور نہ قرآن کریم حدیث کا محتاج ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی طرف سے جب سوال ہوتا ہے تو اسی رنگ میں ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم کسی اور چیز کا محتاج ہے؟ اس سوال میں درحقیقت ایک مغالطہ ہے۔ اور بعض لوگ گھبرا اٹھتے ہیں کہ آیا فی الواقع قرآن شریف کوئی ایسی ناقص چیز ہے کہ وہ کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ہم قرآن کریم کو ایک کامل کتاب مانتے ہیں کسی دوسرے کا محتاج اُسے قرار دینا اُسے ناقص فرض کرنا ہے مغالطہ اس میں یہ ہے کہ فی الواقع قرآن شریف تو کامل ہے اور کسی کا محتاج نہیں۔ مگر ہم اس کے سمجھنے کے لئے بہت سی چیزوں کے محتاج ہیں۔ ہم اُس زبان کے محتاج ہیں جس میں قرآن شریف نازل ہوا۔ کہ اُس کو جانیں۔ ہم لغت کے محتاج ہیں۔ گو وہ لغت کی کتابیں قرآن شریف کے بعد ہی بنی ہوں، ہم صرف ونحو کے محتاج ہیں۔ کیونکہ صرف ونحو نے زبان کے قواعد کو منضبط کر دیا۔ اگر ان چیزوں کو ہم نہیں جانتے تو قرآن شریف کو ہم نہیں جان سکتے۔ اسی طرح پر قرآن شریف کو سمجھنے کیلئے ہم حدیث کے محتاج ہیں اور یہ ایک موٹی بات ہے کہ جس طرح اپنے اپنے زمانہ میں مفسرین نے اور اہل علم نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے قرآن کریم کے متعلق بہت کچھ لکھا حتیٰ کہ اس زمانہ میں مولوی عبداللہ صاحب کو ایک ضخیم ترجمہ، تفسیر، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق کتابیں لکھنی پڑیں تاکہ قرآن کریم کی اصل منشاء سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ اسی طرح اور اس سے بہت بڑھ کر زور قرآن کریم کے وقت یہ ضرورت تھی کہ اُس قلب مقدس کا مالک جس پر یہ کلام نازل ہوا اور جو دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر اُس کے اصل منشاء کو سمجھتا تھا۔ اس منشاء سے دوسروں کو آگاہ کرے۔ اُس نے اپنے قول سے اور اپنے فعل سے اُس اصل منشا کو لوگوں پر ظاہر فرمایا اور اُسی کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ اور جس طرح وہ لوگ قرآن کریم کے اصل منشا کو سمجھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے محتاج تھے اور اس اصل منشاء کو مہبط وحی صلعم

سے بڑھ کر کوئی سمجھنے والا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہم بھی اُس اصل منشا کو سمجھنے کے لئے حدیث کے محتاج ہیں ٭

خدا قوانین کا محتاج نہیں مگر انسان ہے

میں اس بات کو دُہرانا چاہتا ہوں۔ انسان دنیا میں بیشمار چیزوں کا محتاج ہے۔ قرآن شریف کے کامل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اب انسانوں کو اور کسی شئے کی احتیاج نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں انسان کو ملتی ہیں اور وہ جس طرح ملتی ہیں وہ سب امور ایک قانون کے ماتحت ہیں۔ اور اسی قانون کے مطابق وہ چیزیں ملتی ہیں۔ خدا اُن قوانین کا محتاج نہیں۔ مگر انسان کو اُن سب کا محتاج کہیں گے۔ ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ملتی ہے۔ وہ جبرائیل لاتے ہیں۔ پس پہلی شاخ تو اُس قانون کی یہی ہے۔ پھر حضرت جبرائیل اُسے ایک قلب صافی پر نازل کرتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ اپنا پیغام پہنچانے کے لئے چن لیتا ہے۔ یہ دوسری شاخ اُس قانون کی ہوئی اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے براہ راست انسانوں کو اپنا کلام پہنچاتا یا رسول بشر کو ہی بغیر کسی واسطہ کے اپنا کلام پہنچاتا مگر یہ اُس کا قانون ہے اب ہم یوں نہیں کہیں گے کہ نعوذ باللہ من ذالک خدا بھی جبرائیل کا محتاج ہے۔ یا محمد رسول اللہ کا محتاج ہے۔ نہیں یہ ایک ضروری واسطہ ہے۔ جو قانون الٰہی کے ماتحت پایا جاتا ہے۔ پھر دوسرا مرحلہ انسانوں تک اس ہدایت کے پہنچنے کا یہ ہے کہ وہ رسول اُس کلام کو جو اُس پر نازل ہوتا ہے اُن پر پڑھ دیتا ہے۔ مگر صرف پڑھ دینا بھی کافی نہیں بلکہ اُن کو اُس کی تعلیم دیتا ہے یعنی اُس کے اصل منشا سے اُن کو آگاہ کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا یتلوعلیہم ایاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ پس قانون الٰہی نے یہ ضروری ٹھہرایا کہ ہدایت الٰہی بندوں تک ان سب واسطوں سے پہنچے یعنی اول جبرائیل رسول بشر کو پہنچائے پھر رسول بشر دوسرے انسانوں کو پہنچائے۔ اور نہ صرف پہنچائے۔ بلکہ اُس کی تعلیم کرے یعنی اُس کے اصل منشا سے اُن کو آگاہ کرے۔ یہ ایک زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں ان کے باہم تعلق کے بغیر وہ زنجیر نہیں بنتی گو اپنی جگہ ہر ایک کڑی اس زنجیر کی اعلیٰ درجہ کی مکمل ہو۔ ہم انسان اس زنجیر کی ساری کڑیوں کے یکساں محتاج ہیں۔ ان میں سے ایک کڑی بھی نہ ہو تو ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ قرآن شریف پر عامل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کا علم حاصل کریں اس علم کے حاصل کرنے میں ہم تو لغت و صرف و نحو کے بھی محتاج ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم کے محتاج کیوں کر نہ ہوں۔ مولوی عبداللہ سے

پیرو اگر اس بات کے محتاج ہیں۔ کہ مولوی عبداللہ نے اس قرآن کو کیونکر سمجھا تو ہمیں بھی یہ فخر حاصل ہے کہ ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک اور سراپا نور فہم کے محتاج ہیں۔ افسوس اُس شخص پر جو قرآن شریف کے سمجھنے کے لئے اپنے آپکو لغت اور صرف و نحو کا محتاج تو سمجھتا ہے۔ مگر اُس پاک سرچشمہ کی احتیاج سے اپنی زبان تشنہ کو آزاد کرکے پیاسا مرنا چاہتا ہے۔ جہاں سے وہ کلام پھوٹ کر نکلا۔ یہ احتیاج سے آزادی نہیں یہ ہلاکت اور بربادی ہے +

قرآن کے مفصل ہونے کے باوجود مولوی عبداللہ کی تشریحات

اگر کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی کتاب کے منشاء کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کوئی نہیں کیونکہ قرآن شریف تفصیل کل شئ ہے (یوسف ۱۱۱) یعنی ہر چیز کی تفصیل۔ اور فرمایا کل شئ فصلناہ تفصیلا (بنی اسرائیل ۱۲) ہر ایک چیز کو ہم نے اس میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اور فرمایا یہ کتاب مفصل ہے (الانعام ۱۱۵) یعنی اس میں ہر ایک چیز کھول کر بیان کر دی گئی۔ اور اس کو تبیانًا لکل شئ (النحل ۸۹) کہا گیا ہے یعنی ہر ایک چیز کو بیان کر دینے والی پس کسی قسم کی تشریح یا تفصیل کی حاجت ہی اُس نے باقی نہیں چھوڑی۔ ساری تشریحات اور تفصیلات اُس کے اندر موجود ہیں۔ ایک شخص حیرت میں رہ جاتا ہے جب ایک طرف مولوی عبداللہ صاحب کے اُن دلائل کو پڑھتا ہے اور دوسری طرف ایک حکم اقیموا الصلوٰۃ کی تشریح کے لئے چارسو سے زائد صفحوں کی ایک کتاب میں سے اسے گزرنا پڑتا ہے جس کا نام ہے برہان الفرقان علی صلوٰۃ القرآن۔ ایک طرف مولوی صاحب کے اس قول کو دیکھو کہ "قرآن مجید میں دین اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح طور پر بیان ہو گئی ہے۔ تو اب وحی خفی یا حدیث کی کیا حاجت رہی بلکہ اس کا ماننا اور دین اسلام میں اس پر عملدرآمد کرنا سراسر کفر شرک ظلم فسق ہے" اور دوسری طرف ایک نماز کی تشریح کے لئے چارسو صفحات کو دیکھو حالانکہ حدیث کی کسی کتاب میں چارسو صفحات کی نماز کی تشریح کے لئے ضرورت نہیں پڑی۔ جب حدیث کی عدم احتیاج ثابت کرنی ہو تو قرآن میں ہر چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح طور پر موجود ہو جاتی ہے۔ اور جب نماز کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے راہ بتانی ہو تو چارسو صفحات کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور تعجب ہے کہ دین اسلام میں حدیث پر عمل درآمد کرنا تو سراسر کفر شرک ظلم فسق ہے! مگر مولوی عبداللہ صاحب کے چار سو صفحات کی تشریح پر عملدرآمد کرنا اور اسے پڑھنا موجب ہدایت ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فہم قرآن ہمارے سامنے آئے تو ہم اُس سے بیزار ہوں کیونکہ قرآن مفصل و مشرح

ہے! مگر مولوی عبداللہ صاحب کا فہم و تشریح قرآن عین ہدایت ہے! العیوذ باللہ من ذالک۔ اے اہل قرآن کہلانے والو! یہ ہیں کہ از کہ بریدی و باکہ پیوستی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فہم و تشریح کو چھوڑا تو مولوی عبداللہ کے فہم و تشریح کو قبول کیا۔ تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ۔ کہا جائے گا کہ مولوی عبداللہ صاحب قرآن شریف سے ہی استدلال کرتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ استدلال کے کیا معنی جب ہر ایک چیز قرآن شریف میں مفصل و مشرح موجود ہے۔ اور پھر یہ استدلال بھی عجیب ہیں۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے دو تین مقام پیش کرتا ہوں تاکہ مولوی عبداللہ صاحب کے اس دعویٰ پر کچھ روشنی پڑے کہ قرآن کریم میں ہر ایک چیز دین اسلام کی من کل الوجوہ مفصل و مشرح ہے۔

قرآن میں بین السجدتین بیٹھنے کا حکم | دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا چاہئے۔ یہ بھی قرآن شریف میں مفصل و مشرح موجود ہے۔ مگر اس تفصیل کو دیکھئے۔

"دو سجدے ہو ہی نہیں سکتے جبتک کہ پہلے سے سر نہ اُٹھایا جائے۔ آیت سجدتین میں دوسرا یخرون الخ ظاہر کرتا ہے کہ انبیا جب دوسرے سجدے میں گرتے تھے تو گرنے سے پہلے سجدہ میں نہیں ہوتے تھے ...... پس پہلے سجدہ سے سر اُٹھائے بغیر دوسرا سجدہ نہیں ہو سکتا۔ سر اُٹھا کر چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ زمین سے تھوڑا سا سر اونچا کر کے دوسرے سجدہ میں گر جائے جیسا کہ اکثر جلد باز نمازی کرتے ہیں۔ دویم یہ کہ لیٹ جائے۔ سوم بیٹھ جائے۔ چہارم کھڑا ہو جائے۔ اول و دوم اس لئے جائز نہیں کہ یہ دونوں خر میں داخل ہیں۔ خر کے معنی ہیں جھکنا۔ گرنا پہلی جھکنے میں شامل ہے اور دوسری گرنے میں۔ پس ان دونوں صورتوں میں انسان حالت خر میں ہی ہوتا ہے اور خر سے خر جائز نہیں بلکہ عدم خر سے یعنی ایسی حالت سے جس پر خر کا اطلاق نہ ہو سکے اور جو کامل طور پر اُس کا ضد و نقیض ہو۔ تیسری اور چوتھی صورت میں خر نہیں اور وہ اُس کے بالکل ضد و نقیض ہیں۔ اب یہ امر قابل غور ہے کہ ان دونوں میں سے کونسی صورت فرض ہو۔ جاننا چاہئے کہ تیسری صورت یعنی بیٹھنا فرض ہے۔ دلیل۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے آت ذالقربےٰ حقہٗ کہ نزدیکیوں کو اُن کا حق دے۔ بیٹھنا سجدہ کا قریبی و نزدیکی ہے اور قیام اُس سے دور و بعید ہے۔ سجدے میں جس قدر اندام زمین کے قریب ہوتے ہیں بیٹھنے میں اُس سے کم اور کھڑا ہونے میں اُس سے بھی کم۔ اس وجہ سے بھی بیٹھنا سجدہ کے نزدیک تر ہے بہ نسبت قیام کے ...... پس قعود ہی اس بات کا

مستحق ہی کہ وہ سجدہ سے متصل ہو قیام نہیں" برہان الفرقان صفحہ ۲۶۷ و ۲۶۸- میں نے بہت سی عبارتوں کو چھوڑ دیا ہی- اور بطور نمونہ یہ دو سجدوں میں بیٹھنے کا حکم جو بزعم مولوی صاحب قرآن شریف میں مفصل و مشرح موجود ہی اس کا ایک جملہ بیان کر دیا ہی- قارئین کرام یہ نہ سمجھیں کہ مولوی عبداللہ صاحب نے یہ قرآن شریف کی کسی عبارت کا ترجمہ کر دیا ہوگا- کیونکہ جو چیز مفصل و مشرح موجود ہو اس کی مزید تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ حدیث کے رد کرنے کیلئے مولوی صاحب ضروری سمجھتے ہیں نہیں یہ سارے قیاسات مولوی صاحب کے از خود تراشیدہ ہیں (یہ صحیح ہوں یا غلط اس سے اس وقت بحث نہیں) اور قرآن شریف کی آیت صرف ایک ہی بیان کی ہے جس سے دو سجدوں میں بیٹھنے کا حکم نکلتا ہی- بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جس میں وہ حکم من کل الوجوہ مفصل و مشرح موجود ہی- اور وہ آیت یہ ہی وات ذالقربی حقہ یعنی قریبی کو اس کا حق دو- مگر جہاں ایک قریبی کو حق ملا- افسوس ہی کہ دوسرا اس سے زیادہ قریبی محروم رہ گیا- اور وہ زیادہ قریبی لیٹ جانا تھا- کیونکہ قعدہ یا جلسہ کو سجدہ کا قریبی قرار دینے کے لئے مولوی صاحب نے دلیل یہ دی ہی کہ سجدے میں جس قدر اندام زمین کے قریب ہوتے ہیں بیٹھنے میں اس سے کم ہوتے ہیں" میں کہتا ہوں اس دلیل سے لیٹنا بیٹھنے سے بھی زیادہ قریبی سجدہ کا ہی- اور وات ذالقربی حقہ میں زیادہ قریبی کا حق ادا ہونا چاہیئے ورنہ یوں تو کھڑے ہونا بھی قریبی ہی جیسا کہ مولوی صاحب کو خود اعتراف ہے یہ ایک بات ہے جو اہل قرآن کو آج تک نہیں سوجھی کہ جن دلائل سے وہ قرآن شریف سے نماز میں کھڑے ہونے رکوع سجدہ قعدہ کا حکم نکالتے ہیں انہی دلائل سے لیٹنے کا حکم بھی نماز میں پایا جاتا ہی الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبہم وہ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے۔ اور ذکر سے مراد نماز ہی ہی جیسا کہ مولوی عبداللہ صاحب نے بڑی محنت سے ثابت کیا ہی پس یہ تو نص صریح ہی اور لیٹنا سجدہ کا سب سے زیادہ قریبی بھی ہی پس ایک سجدہ کر کے لیٹ جانا چاہیئے اور پھر کھڑے ہو کر (کیونکہ اضداد میں سے ایک کا ذکر ہو تو دوسرے کا نہیں ہوتا اور لیٹنا و کھڑے ہونا ایک دوسرے کی پوری ضد ہیں- اور قرآن شریف میں ساجدا و قائما بھی آیا ہی جس سے اس کو مزید قوت ملتی ہی) سجدہ میں گرنا چاہیئے- امید ہے کہ یہ اضافہ بھی اہل قرآن اپنی نماز میں اس مفصل و مشرح حکم کے ماتحت کریں گے- اب اگر کوئی شخص خداداد عقل سے کام لینا چاہتا ہو تو وہ آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتا ہی کہ مولوی عبداللہ

صاحب کی یہ تشریح بین السجدتین بیٹھنے کے لئے زیادہ تسکین دینے والی ہو یا یہ امر کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بین السجدتین بیٹھکر دکھا دیا کہ مسلم کی صلوٰۃ یہی ہو ◆

قرآن میں تکبیر کے وقت کان پکڑنے کا حکم

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو. صفحہ ۲۸۲ سے مضمون شروع ہوتا ہو ◆
"تکبیر کہتے وقت کان پکڑنے کے بیان میں"

پورے دس صفحوں کے بعد دلیل آتی ہو قل ارایتم ان اخذ اللہ سمعکم و ابصارکم وختم علےٰ قلوبکم من الہ غیر اللہ یاتیکم بہ انظر کیف نصرف الآیات ثم ھم یصدفون
شاید کسی کو تعجب ہو کہ اس میں کان پکڑنے کا حکم کہاں مفصل و مشرح موجود ہو تو اس کی وجہ مولوی صاحب یہ بتائیں گے کہ تم لوگ قرآن کو غور سے نہیں پڑھتے. مولوی صاحب نے چونکہ غور سے پڑھا ہو اس لئے اُن کے معنی قبول کرنے ہوں گے وہ معنی یوں ہیں ◆
"اے پیغمبر جو لوگ کانوں آنکھوں اور دل کو نماز میں ذلیل و حقیر نہیں کرتے یعنی کانوں کو نہیں پکڑتے آنکھوں کو ادھر اُدھر دیکھنے سے نہیں روکتے اور دل میں خوف ربی نہیں رکھتے اُن سے) کہہ دو کہ سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ اگر اللہ تمہارے کان پکڑ لے (بہرے کردے) اور تمہاری آنکھیں (مٹادے) اور تمہارے دلوں پر بندش کردے تو سوائے خدا کے تمہارا کوئی بزرگ ہو جو تم کو یہ چیزیں لادے (پس جبکہ کوئی ایسا نہیں تو بہتر ہے تم خود ہی نماز میں اپنے کان پکڑا کرو آنکھوں کو اِدھر اُدھر دیکھنے سے روکا کرو دل میں خدا کا خوف رکھو تاکہ خدا تمہارے کان نہ پکڑے آنکھیں نہ مٹادے دلوں پر بندش نہ کردے) دیکھ (اے رسول) کیونکر ہم طرح طرح پر تضرع کی آیات بیان کرتے ہیں. اس پر بھی یہ لوگ (قرآنی تضرع سے) منہ پھیرے چلے جاتے ہیں" صفحہ ۲۹۲
چونکہ مولوی صاحب کا ایمان یہ ہو کہ قرآن شریف مفصل و مشرح ہو اور اس کی کسی اور تشریح کی حاجت ہی نہیں اس لئے دیکھئے کس قدر احتیاط ترجمہ میں مولوی صاحب نے کی ہو کہ اپنی طرف سے سطروں کی سطریں بڑھادی ہیں. اور یہ نماز میں کان پکڑنے کی دلیل ہو. اگلے زمانہ میں جو ملّا لڑکوں کے کان پکڑوایا کرتے تھے وہ بھی شاید اسی آیت سے دلیل لیتے ہوں اور اب یہ جھگڑا طے کرنا باقی رہے گا کہ کیوں نماز میں اس طرح کان نہ پکڑے جائیں جس طرح مکتبوں میں طالبعلموں کے پکڑوائے جاتے تھے کیونکہ پوری ذلت تو اسی طرح ہوتی ہو. اگر یہ قرآن شریف ایسی مقدس کتاب کے ساتھ ہنسی نہیں تو اور کیا ہو کہ چونکہ خدا فرماتا ہو کہ اگر وہ چاہے تو تمہاری شنوائی لیجائے اس لئے یہاں یہ مشرح و مفصل حکم موجود ہو کہ اگر تم نماز پڑھتے وقت کان نہ پکڑو گے تو خدا تمہارے

کان پکڑے گا اور پھر یہاں تو بصارت کے بچانے کا بھی ذکر ہی جس کا ترجمہ مولوی صاحب کے نزدیک یہ ہونا چاہئے کہ نماز پڑھتے وقت اپنی آنکھوں میں انگلیاں مارا کرو۔ تعجب ہے کہ اس تفسیر نویسی پر یہ ادعا کہ دین اسلام کے کل احکام مشرح و مفصل قرآن شریف میں موجود ہیں +

مگر یہ کان پکڑنے کا مضمون مولوی صاحب کو اس قدر پسند ہی کہ اس پر یہی ایک دلیل کافی نہیں سمجھی بلکہ قرآن شریف سے اور بھی مشرح اور مفصل احکام کان پکڑنے کے متعلق نکالے ہیں چنانچہ دوسری دلیل صفحہ ۹۵ سے شروع ہوتی ہی۔ اور وہ یہ ہی کہ فصل لربك وانحر میں بھی کان پکڑنے کا حکم ہی اس مشرح و مفصل حکم کی تشریح میں بھی مولوی صاحب کو تیرہ صفحے لکھنے پڑے ہیں فصل لربك وانحر کا ترجمہ "نماز پڑھ اپنے رب کی اور قربانی کر" کی بجائے مولوی صاحب یوں کرتے ہیں "تو اپنے رب کی نماز پڑھا کر خاصکر (اپنے وجود کے) اونٹ (کان) کو ذبح (ذلیل و حقیر یعنی پکڑا) کر ہر تکبیر کیساتھ" مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ نحر تو اونٹ کی قربانی کو کہتے ہیں مگر یہاں اونٹ کی قربانی کا ذکر نہیں بلکہ انسان کے وجود میں جو اونٹ ہے اُس کی قربانی مراد ہی اور وہ وجود کا اونٹ کان ہی کیونکہ جس طرح اُونٹ سے بہت نفع پہنچتا ہی کان سے بھی بہت نفع پہنچتا ہی اور اُس کے ذبح کرنے سے مراد اُس کا ذلیل کرنا ہی اور ذلیل کرنے سے مراد اُس کو پکڑنا ہی پس ثابت ہوا کہ نماز میں ہر تکبیر کے ساتھ کان پکڑنے کا حکم مشرح و مفصل قرآن شریف میں موجود ہی۔ ہمارے آریہ دوست ویدوں کی اس قسم کی تفسیر سے وہاں سے ہوائی جہاز اور ریل اور تار برقی اور جو کچھ آیندہ ایجادات ہونی چلی جائیں نکالا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے خیال کیا کہ قرآن کیوں پیچھے رہے اس میں سے بھی سب کچھ نکالنا چاہئے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ قرآن شریف کی محبت ہی ہوگی جو ان کو اور ان کے ہمخیالوں کو اس طرف لے گئی۔ لیکن ان باتوں پر لوگ اگر ہنسی کریں تو حق بجانب ہیں۔ پھر تعجب یہ ہی کہ قدم قدم پر مولوی صاحب نے قرآن شریف میں مجازاً و رکنایہ مانا ہے۔ حالانکہ یہ اُن کے دعوی کے کہ ہر چیز اس میں ایسی مشرح و مفصل موجود ہی کہ کسی مزید تشریح کی ہم کو حاجت نہیں سراسر خلاف ہی کیونکہ مجاز او رکنایہ مزید تشریح کو چاہتے ہیں +

قرآن سے نماز کی رکعتوں کی تعداد — نماز کی رکعتیں معلوم کرنے کے لئے بھی مولوی صاحب کو بہت کچھ محنت کرنی پڑی ہی اور یہ مسئلہ پورے ۴۵ صفحوں کی تشریح کے بعد حل ہوا حالانکہ ہر ایک حکم دین اسلام کا قرآن شریف میں ایسا مشرح و مفصل موجود تھا کہ دوسری کتاب کو ہاتھ لگانا جُدا

کی نافرمانی نہیں داخل تھا۔ مگر مولوی صاحب نے اپنے ہمخیالوں کو اگر حدیث کو ہاتھ لگانے سے بچایا جہاں چند سطروں میں رکعتوں کا مضمون آجاتا ہے تو پچاس صفحے رکیک تاویلوں کے اُن کے سپرد کئے کہ اُن کو پڑھ کر خدا کے حکم کی نافرمانی کیا کریں کیونکہ جو چیز قرآن شریف میں شرح و مفصل موجود تھی۔ مولوی صاحب اُسی کی تشریح و تفصیل کرنے بیٹھ گئے۔ رکعتوں کا کسی نماز میں دو کسی میں تین کسی میں چار ہونا تو ذیل کی آیات میں مشرح و مفصل موجود ہے الحمد للہ فاطر السموات والارض جاعل الملٰئکۃ رسلا اولی اجنحۃ مثنٰی وثلٰث ورٰبع یزید فی الخلق مایشاء اس کا جو ترجمہ لفظی ہے یعنی "یہ کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو رسول بناتا ہے دو دو تین اور چار چار جناحوں والے جو چاہتا ہے پیدائش میں بڑھاتا ہے"۔ یہ تو عدم تدبر کا نتیجہ ہے (یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ فرشتے چونکہ اس قسم کی مادی مخلوق نہیں جیسے حیوان یا پرند اس لئے اُن کے جناح بھی فی الواقع پرندوں کے پر یا بازو نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اُن کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے) اور اصل معنی مولوی صاحب جس کرتے ہیں جو قرآن کریم کے مشرح و مفصل ہونے پر عجیب دلیل ہے "پڑھا کرو (اے ہر ایک اہل آسمان و اہل زمین) الحمد (یعنی پانچوں نمازیں) واسطے راضی کرنے اللہ کے۔ کیونکہ وہ فطرت پاک پیدا کرنے والا ہے۔ تم تمام آسمان والوں (فرشتوں کی) اور تم تمام روئے زمین والوں (جن وانس) کی (چونکہ تم فطرت اللہ میں تغیر و تبدل کرنے رہتے ہو اس لئے نمازیں پڑھتے رہا کرو تاکہ جبر نقصان ہوتا رہے اور اللہ وہ ہے جو کرنے والا ہے اپنے فرشتوں کو رسول تمہاری طرف جو لانے والے تمہاری صلوٰتوں یعنی رکعتوں کے ہیں جن کا حق یہ ہے کہ وہ دو دو بار دو کی جاویں اور تین تین بار۔ اور چار چار بار مطابق تعلیم کتاب اللہ (یعنی جس وقت کی اللہ تعالیٰ نے دو رکعتیں مقرر کر دی ہیں اُس کی دو پڑھو جس کی تین فرمائی ہیں اُس کی تین اور اگر وہ جس کی چار معین کی ہیں اُس کی چار پڑھو) اس سے اللہ جبر نقصان کرنا چاہتا ہے۔ تمہاری تبدیل شدہ فطرت کا جس قدر انسان چاہتا ہے (یعنی جس قدر نمازیں توجہ و خشوع کرتا ہے" صفحہ ۳۴۱

اس شرح و مفصل حکم کی اس مفصل مشرح تشریح پر کچھ اور بڑھانا لاحاصل ہے۔ ہاں اس سوال کا خوب جواب دیا ہے کہ کس کس نماز کے لئے دو رکعت ہیں کس کے لئے تین کس کیلئے چار اس کی تشریح تفصیل قرآن کریم میں یوں بیان ہوئی ہے کہ نماز قصر بحالت اشد خوف امام کی دو رکعت ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان

یفتنکم الذین کفروا سے معلوم ہوتا ہی اور قیاس یہ چاہتا ہی کہ مقتدی بھی دو رکعت ہی ادا کریں گو قرآن مجید میں باوجود شرح و مفصل ہونے کے مقتدیوں کی ایک ہی رکعت کا ذکر ہی اور دوسری رکعت کا ذکر نہیں ہی۔ اور قصر چونکہ نصف ہوتا ہے اس لئے پوری نماز بحالت اشد امن چار رکعت ہوئی۔ اور اشد امن دن کے تین وقتوں میں ہوتا ہی یعنی ظہر عصر اور عشاء اور صبح کا وقت اشد خوف کا ہوتا ہی۔ کیونکہ "صبح کے وقت نیند کے ہاتھوں انسان بالکل بے بس و بے اختیار و لاچار ہوتا ہی" پس اس وقت اشد خوف والی نماز یعنی دو رکعت پڑھنی چاہیئے اور شام کے وقت بھی انسان کاروبار مویشی کے بکھیڑوں میں سرگردان حیران و پریشان ہوتا ہی اور سخت مجبور ہوتا ہی .... پس یہ درمیانہ وقت ہی کہ نہ تو انسان اس وقت بالکل مردہ و بے اختیار ہوتا ہی مثل صبح کے اور نہ ظہر کی طرح کامل فراغت اطمینان ہوتا ہی" پس اس کی نماز بھی درمیانہ ہوئی یعنی تین رکعت۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ کا عمل جو حدیث میں محفوظ ہی یہ بتاتا ہے کہ نماز صبح دو رکعت اور نماز مغرب تین رکعت اور ظہر عصر عشا چار چار رکعت ہیں تو یہ قابل قبول نہیں۔ بلکہ اس بنا پر دو تین چار رکعت نماز پڑھنا شرک کفر فسق ظلم ہی خدا کے حکم کی نافرمانی ہی۔ لیکن جب مولوی عبداللہ صاحب مذکورہ بالا وجہ بیان کردیں تو پھر یہ عین حکم الٰہی ہی

نئے اہل قرآن اور ان کی نماز

مولوی عبداللہ صاحب کے آج کل کے بعض پیروان تشریحات سے تنگ آکر یہ کہنے لگتے ہیں کہ مولوی عبداللہ صاحب نے حدیث کی عینک سے قرآن کو پڑھا ہی۔ مگر جو شخص بھی اقیموا الصلوۃ کے حکم کو منجانب اللہ مان کر اس کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہی وہ بغیر حدیث کی عینک کے قرآن کو نہیں پڑھ سکتا خواہ وہ ایک سچے مسلم کی طرح آنحضرت صلعم کے قول و فعل کو بسر و چشم قبول کرے اور خواہ مولوی عبداللہ کی طرح ان چیزوں کو پس پشت پھینکتا ہوا آخر کئی سو صفحات کی تاویل رکیک سے اسی کے مطابق نماز بنائے۔ ہاں اب اس فرقہ میں وہ اباحتی گروہ پیدا ہوتا جاتا ہی جو کسی چیز کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اور مولوی عبداللہ نے تو صرف اذکار نماز میں کچھ تغیر کیا تھا۔ ان لوگوں نے پانچ نمازوں کی تین نمازیں بھی بنائی ہیں۔ اور ہر نماز صرف دو رکعت بھی ہی اور ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ رکھا ہی۔ اور رکوع قعدہ وغیرہ کو بالکل نکال دیا ہی۔ کیونکہ حدیث تو مولوی صاحب نے ان سے چھڑا دی اور مولوی صاحب کی رکیک تاویلیں ان کا دماغ قبول نہیں کرتا۔ مگر حدیث کی عینک کو پورے طور پر ابھی انہوں نے بھی اتار کر نہیں پھینکا۔ کیونکہ سورۂ فاتحہ کو نماز میں پڑھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن شریف میں کہیں حکم نہیں۔ کہ سورہ فاتحہ نماز

میں پڑھی جائے ولقد آتینٰک سبعاً من المثانی میں اول سبعاً من المثانی سے فاتحہ مراد لینا خلاف تشریح و تفصیل ہے۔ پھر وہاں یہ نہیں لکھا کہ اس کو نماز میں پڑھا کرو۔ پھر نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم بھی کہیں نہیں فاقرؤا ما تیسر من القرآن اور ما تیسر منہ کے ساتھ فی الصلوٰۃ نہیں پھر تین وقت نماز پڑھنے کا بھی ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الیٰ غسق اللیل کے ظاہر معنی تو صرف یہی ہیں کہ آفتاب کے زوال سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز پڑھتے رہو۔ مشرح و مفصل حکم تین وقت نماز پڑھنے کا کہیں نہیں پھر خوف کے وقت قصر کے متعلق تو یہ فرمایا کہ ایک گروہ امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ جائے۔ اور دوسرا گروہ دوسری رکعت پڑھ جائے اب یہ کون بتائے کہ یہ قصر نماز امام کی ہے یا مقتدیوں کی۔ مولوی عبداللہ تو کہتے ہیں کہ قصر امام نے کی ہے پس اصل نماز چار رکعت ہوئی۔ ان کے نئے ہمخیال کہتے ہیں قصر مقتدیوں نے کی ہے اصل نماز دو رکعت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن شریف کا حکم تو ایک ہی ہوگا یا تو مولوی عبداللہ خلاف قرآن کرتے رہے یا ان کے نئے پیرو خلاف قرآن کر رہے ہیں ان دونوں کے درمیان فیصلہ کون کرے۔ مشرح و مفصل حکم موجود ہونے کے باوجود استاد اور شاگرد میں اس قدر اختلاف ہے دوسروں کو الگ رکھو۔ اور ابھی معلوم نہیں آئندہ کیا اختلاف پیدا ہوں گے ✦

مولوی صاحب اور ان کے شاگردوں میں اختلاف باوجودیکہ قرآن مفصل ہے

مولوی عبداللہ صاحب کو قرآن شریف کے مشرح و مفصل احکام میں دو اور تین اور چار رکعتیں نظر آتی ہیں ان کے پیرووں کو دو نظر آتی ہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب کو نماز شروع کرتے وقت کان پکڑنے کا حکم مشرح و مفصل نظر آتا ہے ان کے پیرووں کو نظر نہیں آتا۔ مولوی عبداللہ صاحب کو پانچ نمازیں نظر آتی ہیں۔ ان کے پیرووں کو صرف تین دکھائی دیتی ہیں مولوی صاحب کو دو سجدے اور رکوع جلسہ قعدہ کا حکم نظر آتا ہے۔ شاگردوں کو یہ باتیں دکھائی نہیں دیتیں۔ اب فرمایئے ان میں فیصلہ کون کرے۔ معلوم ہوا ان سب کا اعتقاد یہ ہے کہ باوجود مشرح و مفصل ہونے کے کچھ مزید تشریح و تفصیل کی ضرورت باقی ہے جس میں اختلاف ہو رہا ہے اور وہ اختلاف ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ کرنے والا اب کوئی نہیں۔ استاد کچھ کہتا رہا۔ شاگرد کچھ کہتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان میں سے کس کا تتبع کریں۔ اور ابھی جو آئندہ اور بھی ذہین طبیعتیں سب قیدوں سے آزاد پیدا ہوں گی وہ ان نئے شاگردوں کی بھی وہی گت بنائیں گی جو انہوں نے استاد کی

بنائی ہو پس باوجود مفصل و مشرح ہونے کے اب تک یہ پتہ فی الحقیقت نہ لگا کہ جس الصلوٰۃ کا حکم اقیموا الصلوٰۃ میں قرآن شریف نے دیا ہو۔ وہ کیا ہے +

بموجب عقیدہ اہل قرآن نماز امن کا ذکر قرآن میں نہیں نماز خوف کا ہے

مولوی عبداللہ صاحب کے نئے پیروؤں کا یہ استدلال کہ نماز میں صرف قیام اور سجدہ ہے اور بس قرآن کریم کی اس آیت سے ہی جس میں نماز خوف کا ذکر ہو۔ دیکھو سورۂ نساء آیت ۱۰۱ و ۱۰۲ فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا۔ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو قصر کرو اگر تم کو خوف ہو کہ کافر تم کو فتنہ میں ڈالیں گے۔ اس کے بعد نماز خوف کی صورت یوں فرمائی واذا کنت فیہم فاقمت لہم الصلوٰۃ فلتقم طائفۃ منہم معک ولیاخذوا اسلحتہم فاذا سجدوا فلیکونوا من وراءکم ولتات طائفۃ اخری لم یصلوا فلیصلوا معک ولیاخذوا حذرہم واسلحتہم۔ یعنی جب تم ان میں ہو پھر ان کے لئے نماز قایم کرو تو ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور چاہیئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں۔ پھر جب وہ سجدہ کریں تو چاہیئے کہ تمہارے پیچھے چلے جائیں اور دوسرا گروہ آجائے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی پس چاہیئے کہ وہ تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور چاہیئے کہ وہ اپنی حفاظت کا سامان اور ہتھیار لے لیں۔ ان الفاظ سے یہ استدلال کیا جاتا ہو کہ نماز میں صرف قیام اور سجدہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ نماز دو رکعت ہو یعنی ایک گروہ نے پہلے ایک رکعت پڑھی اور یہ قصر ہو۔ پس پوری نماز دو رکعت ہوئی جو حالت اطمینان میں پڑھنی چاہیئے۔ اب یہاں چند امور غور طلب ہیں۔ اول یہ کہ آیا یہاں حالت خوف کی نماز کا ذکر کرتے ہوئے اس کے سب ارکان وغیرہ کو بالتفصیل قرآن شریف نے بیان کر دیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر قرآن شریف نماز کو مفصل اور مشرح بیان کرتا ہو تو وہ اس جگہ ہونا چاہیئے جہاں اطمینان کی نماز کا ذکر ہو نہ حالت خوف کی نماز کے ذکر میں جس کا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہو یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں باوجود جنگجوئی کے چند ہی موقع اس کے پیش آئے۔ اور بہت بڑا حصہ مسلمانوں کا بھی جنگ میں نہیں بلکہ حالت امن میں رہتا ہے اور جو جنگ میں ہوتا ہے ان کا بھی بہت تھوڑا حصہ عمر کا جنگ میں گذرتا ہو پس اگر قرآن کریم نماز کا مفصل و مشرح ذکر کرنا چاہتا تھا تو حالت امن کی نماز کا ذکر کرنا چاہیئے تھا نہ حالت جنگ کی نماز کا۔ تفصیل قاعدہ میں دیجاتی ہو نہ استثنا میں۔ استثنا میں صرف ضروری امور کا ذکر کیا جاتا ہو جنکا خاص تعلق استثناء

سے ہو۔ مثلاً روزہ کے متعلق کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک رکھو وغیرہ عام حالت میں تذکرہ کیا یہ نہیں کہ بیمار اور مسافر کے لئے جو استثناء کیا تھا اُس میں روزہ کی تفصیل کی ہو۔ اور یہ ایک کھلی بات ہے جس کی قرآن کریم مخالفت نہیں کرتا کہ تفصیلات قاعدہ میں بتائی جاتی ہیں نہ استثنا میں پس نماز خوف میں صرف انہیں ارکان نماز کا ذکر ہے جن کے بیان کرنے کی ضرورت تھی یعنی ایک تو قیام کا اور دوسرے چونکہ سجدہ کے بعد ایک گروہ نے واپس ہونا تھا اس لئے سجدہ کا ذکر آیا۔ رکوع وغیرہ تفصیلات کی ضرورت یہاں نہ تھی دوسرے خود عبارت سے بھی یہی ظاہر ہے کیونکہ یہاں تو یہ نہیں کہا کہ قیام میں کچھ پڑھو یا سجدہ میں کچھ تسبیح کرو۔ اگر یہی تفصیل نماز ہے تو پھر نماز میں پڑھنا پڑھانا کچھ نہیں چاہئے۔ نہ سجدہ میں کوئی تسبیح کرنی چاہئے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ ذکر دوسری جگہ ہے تو پھر معلوم ہوا یہاں تفصیل نہیں اس لئے اس سے یہ قیاس بھی کہ نماز میں صرف قیام اور سجدہ ہے غلط ٹھہرا۔ تیسرے پہلے گروہ کے متعلق تو ذکر کیا کہ وہ قیام اور سجدہ کریں۔ دوسرے کے متعلق یہ ذکر نہیں کیا بلکہ اتنا ہی کہا کہ وہ تیرے ساتھ نماز پڑھیں۔ اگر کہا جائے کہ قیاس یہی چاہتا ہے تو پھر بات قیاس پر رہی بعض کا قیاس یہ چاہے گا بعض کا نہیں تفصیل نہ ہوئی پہلے گروہ کو کہا تھا وہ اپنے ہتھیار لیں دوسرے کو کہا حفاظت کا سامان بھی لیں اور ہتھیار بھی لیں چوتھے اس قصر میں نہیں فرمایا کہ یہ قصر رکعات کا ہے یا ارکان کا یا اوقات کا بلکہ آگے چل کر جو فرمایا فاذا اطمأننتم فاقیموا الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا یعنی جب حالت اطمینان ہو تو نماز کو قائم کرو کیونکہ نماز مؤمنوں پر اوقات مقررہ کا حکم ہے تو کیا قیاس یہ نہیں ہو سکتا کہ یوں تو حالت اطمینان میں پانچ نمازیں پانچ وقتوں پر دیا تین سہی پڑھا کرو لیکن خوف کے وقت صرف ایک وقت ہی نماز پڑھ لینا کافی ہے۔ پھر کیا قیاس یہ نہیں ہو سکتا کہ نماز خوف میں ارکان کا قصر کر دو یعنی صرف قیام اور سجدہ ہو اور حالت امن میں سارے ارکان ہوں۔ قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعدہ۔ اب یہ کون فیصلہ کرے گا کہ رکعات کا قصر مراد ہے یا ارکان کا قصر مراد نہیں۔ بلکہ دوسری جگہ جو فرمایا فرجالاً او رکبانا۔ یعنی حالت خوف میں پیدل چلتے ہوئے یا سواری کی حالت میں ہی نماز پڑھ لو۔ اور ایسی حالت میں رکوع سجدہ نہیں ہو سکتا۔ تو قیاس غالب یہ رہا کہ قصر ارکان ہی مراد ہے اور اس لئے ارکان نماز خوف سے ارکان نماز اطمینان کا استدلال نہیں ہو سکتا پانچویں یہ کہ نماز خوف کی تو یہ صورت بیان کر دی اور حالت اطمینان میں فرمایا فاقیموا الصلوٰۃ پس ہم کیا جانتے ہیں کہ حالت اطمینان کی نماز کا قیام کیونکر ہو۔ چھٹے یہ کہ امام نے رکعات میں کوئی قصر نہیں کیا اور

قصر سے کیا مراد ہے

مقتدیوں نے کر لیا تو معلوم ہوا کہ امام اور مقتدیوں کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے یہ کہاں سے ثابت ہو گا کہ حالت امن میں نہیں ہو سکتا۔ ساتویں یہ کہ اگر قصر امام کا مانا جائے۔ جیسا مولوی عبداللہ صاحب نے فرمایا ہے تو پھر بھی پوری نماز چار رکعت رہی۔ اور قیاس یہی چاہتا ہے کہ امام اور مقتدیوں نے یکساں رکعات پڑھی ہوں۔ گو مقتدیوں نے امام سے الگ رکعت پوری کر لی ہو۔ کیونکہ یہ تو ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ امام اور مقتدیوں میں رکعات کا تطابق نہ ہو۔ پس اس فرضی تفصیل سے بھی کچھ ثابت نہ ہوا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ قرآن شریف کا ایک ترجمہ کسی ہندو یا عیسائی کے ہاتھ میں دے دو جس نے نہ کوئی حدیث کی کتاب دیکھی ہو نہ کسی مسلمان کو کبھی نماز پڑھتے دیکھا ہو اور اُسے کہو کہ قرآن شریف میں ہماری نماز مفصل و مشرح موجود ہے تم اس تشریح و تفصیل سے ہمارے لئے صورت نماز قائم کر دو تو یقیناً نہ وہ مولوی عبداللہ صاحب والی نماز کی صورت بتا سکے گا نہ اُن کے نئے پیروؤں کی جو قریباً اپنے لئے سب الگ الگ نمازیں بنا رہے ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ جس طرح مولوی صاحب کے نئے پیروان کو یہ الزام دیتے ہیں۔ کہ انہوں نے حدیث کی عینک لگا کر قرآن کو پڑھا اور دو تین چار رکعت والی پانچ نمازیں قرآن شریف سے نہیں نکلتیں یہی الزام ایک تیسرا آدمی خود اُن لوگوں پر دے گا کہ انہوں نے حدیث کی عینک لگا کر سورہ فاتحہ کا نماز میں پڑھنا ضروری قرار دیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اباحت کا دروازہ کھل جائے گا کہ نماز صرف اسی قدر رہے گی۔ کھڑے ہو کر یا سجدے میں گر کر کچھ دعا کر لی جائے اور جب چاہے کوئی کرے۔ اور پھر سجدہ کا فیصلہ ابھی باقی رہے گا کیونکہ بخرون للاذقان سے غالباً یہ بھی کوئی استدلال کرے گا کہ سجدہ میں صرف ٹھوڑی زمین کے ساتھ لگنی چاہئے۔ نہ ناک پیشانی وغیرہ۔

عالم اسلامی کا ارکان نماز پر اتفاق

پس جب خود اہل قرآن کے نزدیک اُن لوگوں کے نزدیک بھی جو دین اسلام کے کل احکام کو قرآن کریم کے اندر مشرح و مفصل مانتے ہیں۔ قرآن شریف کی عبارات کی مزید تشریح و تفصیل بکار ہے تو اس تشریح و تفصیل کی ضرورت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی تھی۔ آپ نے یہ تشریح و تفصیل اپنے قول اور اپنے عمل سے کر کے دکھا دی اسی کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ مولوی عبداللہ اور اُن کے شاگردوں میں جو اختلاف نماز کے اوقات۔ نماز کی رکعات۔ نماز کے ارکان میں ہوا ہے۔ حالانکہ قرآن شریف کے احکام میں سے یہ صرف ایک حکم ہے۔ اس کا بروئے اصول اہل قرآن اب تا قیامت کوئی فیصلہ

نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ابھی چند سو آدمیوں کی حالت ہے جو پندرہ بیس سال کے اندر اندر پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن قربان جائیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ایسی تشریح و تفصیل کی جس پر مشرق سے لے کر مغرب تک تیرہ سو سال کے اندر تمام مسلمانوں کا اتفاق موجود ہے۔ مشرق بعید میں ملک چین میں جا کر دیکھ لو یا سمندر کے اندر علیحدہ علیحدہ جزائر میں دیکھ لو۔ ہندوستان کے میدانوں یا پہاڑوں میں دیکھ لو۔ ترکستان، افغانستان۔ بلوچستان میں دیکھ لو۔ روس اور روم میں دیکھ لو۔ عرب اور افریقہ کے ریگستانوں میں دیکھ لو۔ یورپ کی اسلامی آبادیوں میں دیکھ لو۔ وہی پانچ نمازیں۔ وہی اُن کے اوقات۔ وہی اُن کی رکعات۔ وہی اُن کے ارکان بیسیوں فرقے ہیں لیکن نمازوں کے اوقات رکعات اور ارکان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور نہ تیرہ سو سال میں کبھی ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نزول قرآن کے زمانہ میں کوئی نماز پڑھتے تھے۔ اور یہ بھی مسلم امر ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں باہم اختلافات بھی شروع ہو گئے تھے پس اگر وہ نماز جو تمام اسلامی دنیا اس وقت پڑھتی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نماز نہیں۔ تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو خود صحابہ نے ہی اس نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی تبدیل کر لیا۔ مگر اس کو اہل قرآن بھی نہیں مانتے بلکہ مولوی عبد اللہ صاحب تو سیکڑوں سال تک اصل حالت پر نماز کو مانتے ہیں۔ اور سیکڑوں سال کے بعد احادیث کا بننا مانتے ہیں۔ تو دوسری صورت یہ ہے کہ نماز اس وقت تبدیل ہوئی۔ جب اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ اور مسلمان کم از کم عرب، ایران ترکستان۔ شام۔ مصر میں پھیل چکے تھے۔ بلکہ ہندوستان چین تک بھی پہنچ چکے تھے۔ اب وہ کونسی طاقت تھی جس نے تمام فرقوں کو یک مرتبہ اس نماز کے چھوڑنے پر ایسا مجبور کر دیا کہ وہ اپنے سارے اختلافات کے باوجود اتنا نہیں کرتے کہ کوئی فرقہ یا کسی فرقہ کا کوئی آدمی ہی اصل نماز کو محفوظ رکھے۔ اور وہ کون سے ذرائع تھے جن کو استعمال میں لا کر ہزارہا میلوں اور الگ الگ ملکوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں سے ایک ہی وقت اصل نماز چھڑا کر ایک نئی نماز اُن میں مروج کر دی گئی۔ اور اس کا کرنے والا کون تھا؟ خیالات کی تبدیلی تو آہستہ آہستہ دور تک پہنچ جاتی اور اپنا اثر پھیلا دیتی ہے۔ کیونکہ خیالات کے مالک تھوڑے لوگ ہوتے ہیں لیکن ایسا عمل جو ادنےٰ سے اعلیٰ تک میں پھیلا ہوا ہو۔ اور جو مشرق سے مغرب تک سب لوگوں میں یکساں پایا جاتا ہو اور جس کا اظہار ہر روز لازماً پانچ مرتبہ ہوتا ہو۔ اُس میں فوراً

تبدیلی ہونی تو ممکن نہیں۔ اور تدریجاً تبدیلی پیدا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی کبھی مخالفت بھی کہیں ہوئی ہو۔ بالخصوص فرقہائے مخالف ضرور تھا کہ اس میں ایک دوسرے کے خلاف پہلو لیتے لیکن تعجب یہ ہے کہ ہمیں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ نشان بھی اس فرعونہ اصلی نماز کا نہیں ملتا مولوی عبداللہ صاحب نے تو یہ احتیاط کی ہے کہ اسی مشکل کو دیکھ کر نماز کے اوقات اُس کی رکعات اُس کے ارکان کو وہی رکھا ہے مگر اُن کے ہمخیالوں نے بالکل ہی نئی نماز تجویز کرتے وقت ادنیٰ فکر سے بھی کام نہیں لیا۔ اور اتنا بھی نہیں سوچا کہ جو بات وہ پیش کرتے ہیں اُسے کوئی عقل انسانی قبول نہیں کر سکتی۔ کہ مسلمانوں کے کل فرقے مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے سب کے سب ایک ہی وقت میں اصل نماز کو چھوڑ کر ایک نئی نماز کے بنانے اور اُس کے مطابق احادیث وضع کرنے پر متفق ہو گئے ہوں۔ جو بات محال عقلی ہو اُس پر دلائل دینے کے کیا معنی +

فرضی اختلافات اور اگر یہ کہا جائے کہ حدیث کو مان کر بھی تو نمازوں میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ وہ اختلاف اوقات میں نہیں۔ رکعات میں نہیں۔ ارکان میں نہیں۔ باقی رہیں چھوٹی چھوٹی باتیں ہاتھ سینے کے اوپر باندھے جائیں یا نیچے۔ رفع یدین کیا جائے یا نہیں آمین بلند آواز سے کہی جائے یا ہلکی آواز سے ان میں اختلاف ہونا ایک بالکل معمولی بات ہے اور اس کی اصل وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معاملات میں وسعت رکھی ہے کبھی ایک طرح عمل کر لیا ہے کبھی دوسری طرح لیکن جس طرح تمام مسلمانوں کے پاس ایک ہی قرآن ہے۔ تمام مسجدیں جہاں کہیں ہوں ایک ہی رُخ یعنی قبلہ رُخ بنی ہوئی ہیں اسی طرح نماز بھی تمام مسلمانوں کی ایک ہے۔ اس کے وہی اوقات ہیں۔ وہی رکعات ہیں وہی ارکان ہیں اور یہ اس بات کا کہ یہی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی ایسا عظیم الشان تاریخی ثبوت ہے کہ جو شخص اُس کو رد کرتا ہے۔ وہ دنیا کے کسی تاریخی امر کو قبول نہیں کر سکتا +

نبی کے دو الگ الگ آیات کا پڑھنا اور اُن کی تسلیم دینا اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم باوجود تفصیل کل شئی ہونے کے مزید تشریح و تفصیل چاہتا ہے اور اسی کے احکام کی تشریح تفصیل ہی نبی کریم صلعم نے فرمائی حکم ہوا اقیموا الصلوٰۃ آپ نے نماز پڑھکر دکھا دی کہ صلوٰۃ سے یہ مراد ہے پس اگر ہم لغت کے محتاج ہیں تو اس سے بہت بڑھکر آنحضرت صلعم کی حدیث کے محتاج ہیں اور اگر ہم آنحضرت کی حدیث کے محتاج نہ ہوں گے تو مولوی عبداللہ صاحب کی تشریحات کے محتاج ہوں گے ان کے بھی محتاج نہ ہوں گے تو ان کے کسی پیرو کی تشریحات کے محتاج ہوں گے۔ اب یہ ایک

شخص کا اختیار ہی کہ وہ چاہے تو اُس تشریح کو قبول کرے جو مولوی عبداللہ اور اُن کے ہمخیال پیش کرتے ہیں اور چاہے اُس تشریح کو قبول کرے جو خود مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گو اہل قرآن بھی تشریح کرنے پر مجبور ہوں۔ مگر کیا خود قرآن شریف بھی اپنی کسی تشریح کی حاجت بتاتا ہے میں نے شروع میں کہا تھا کہ قرآن کریم رسول کے دو کام بتاتا ہے ایک یہ کہ وہ اُس کی آیات دوسروں کو پڑھ کر سُنا دے۔ دوسرا یہ کہ وہ اُن کو کتاب کی تعلیم دے ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ مولوی عبداللہ صاحب نے یہ خوب ہتھیار ایجاد کیا ہی کہ ہر جگہ واو عاطفہ کو تفسیری قرار دے دیا اور چھپٹی ہوئی لیکن یہاں یہ ہتھیار کام نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ تلاوت آیات یعنی وحی الٰہی کے پڑھ کر سُنا دینے کے بعد دوسرا جملہ ہی ویزکیھم اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے یعنی ہر ایک قسم کی آلایش سے اُن کو پاک کرتا ہی اب ظاہر کہ تلاوت آیات اور تزکیہ ایک کام نہیں یعنی یوں نہیں کہہ سکتے کہ اُن پر آیات پڑھتا ہے یعنی اُن کا تزکیہ کرتا ہے۔ یہ دو الگ الگ کام ہیں۔ تلاوت آیات اور تزکیہ ایک شے نہیں پھر اس کے بعد تیسرا کام لکھا ہی کہ اُن کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہی جس طرح تلاوت آیات اور تزکیہ ہم معنی نہیں اسی طرح تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت ہم معنی نہیں۔ یہ الفاظ اور مفہوم دونوں کے ساتھ ہنسی ہوگی کہ ہم کہیں کہ معنی یوں ہیں کہ رسول اُن پر آیات پڑھتا ہی یعنی اُن کا تزکیہ کرتا ہے یعنی کتاب وحکمت کی اُن کو تعلیم دیتا ہے۔ یہ خوب تفسیر ہی سیدھے سادے الفاظ تلاوت آیات کی تفسیر کی کہ اس سے مراد تزکیہ ہی اور پھر تزکیہ کی تفسیر کی کہ اس سے مراد تعلیم کتاب وحکمت ہی بھلا ان اُلٹی تفسیروں سے حاصل کیا۔ قرآن کریم جیسے پاک اور پر معنی کلام سے یہ تمسخر ہی کہ تلاوت آیات کی تفسیر تزکیہ سے کیجائے اور تزکیہ کی تفسیر تعلیم سے کی جائے۔

تعلیم کا مفہوم الغرض یہ صاف بات ہی کہ یہاں تین کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمائے ہیں۔ ایک آیات قرآنی کا پڑھ کر سُنا دینا۔ دوسرے اپنے پیروؤں کو آلایشوں سے پاک کرنا جو آپ اپنی قوت قدسی اور دعاؤں اور عقد ہمت اور نمونہ سے کرتے تھے۔ اور تیسرا کام تعلیم کتاب وحکمت ہی۔ گویا تعلیم محض تلاوت سے الگ ہی۔ اب تعلیم کتاب وحکمت سے مراد یہ تو ہو نہیں سکتی کہ اُن کو قرآن شریف حفظ کرا دیں۔ حفظ کرنا اُن کا کام تھا آپ کا کام اُن پر آیات کا پڑھ دینا تھا۔ حفظ کرانا کوئی کام نہیں۔ آپ کا کام تلاوت آیات تھا۔ اور صحابہ کو

پڑھتا سن کر حفظ کر لیتے تھے۔ علاوہ ازیں اُستاد جب شاگرد کو تعلیم دیتا ہے۔ تو وہ صرف کتاب پڑھ کر نہیں سُناتا۔ بلکہ اُس کے اصل مطالب اور منشاء سے اُسے آگاہ کرتا ہے پڑھ کر سُنا دینا اور تعلیم دینا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ چنانچہ مولوی عبداللہ صاحب نے خود بار بار اپنی کتابوں میں اس بات پر زور دیا ہی کہ قرآن کریم میں نبی صلعم کو حکم ہوتا ہے کہ ان اتلوا القرآن یعنی تم پر قرآن کو پڑھ دوں لیکن اتلوا القرآن کے یہ معنی نہیں کہ اس کے سوا دوسرا کوئی کام نہ کروں قرآن کی تلاوت بھی بیشک ایک کام ہی۔ مگر دوسرا کام تعلیم بھی ہی جس کو الگ بیان فرمایا اور تعلیم دینے کے یہی معنی ہیں کہ جو باتیں اُس میں قابل تشریح ہیں آپ اُن کی تشریح فرما دیں ورنہ تلاوت قرآن کے علاوہ تعلیم قرآن کو بیان کرنا بے سود تھا۔ اور یہ آیت جس میں تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کو الگ کام بیان کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں چار مختلف جگھوں پر آئی ہے +

قرآن کا پڑھنا اور اس کا بیان دونوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے بتائے ہیں

گو آیت مذکورہ بالا اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہی کہ قرآن شریف نے تعلیم کو تلاوت سے الگ بیان کر کے اُس کے معانی کی تشریح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام قرار دیا ہی مگر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ ایک اور موقعہ پر قرآن کریم کی تشریح کی ضرورت بتائی ہے۔ فرمایا ان علینا جمعہ وقرانہ فاذا قرانٰہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ بیشک ہم پر ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھ دینا۔ پھر جب ہم اس کو پڑھ دیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر ہم پر ہے اس کی وضاحت کر دینا۔ اب اس جگہ اللہ تعالیٰ نے تین باتیں بیان فرمائیں یعنی ایک جمع قرآن دوسرے اُس کا پڑھ دینا تیسرے اُس کا بیان۔ بیان کیا چیز ہے مفردات میں ہی وسمی الکلام بیانا لکشفہ عن المعنی المقصود لاظہارہ یعنی کلام کو بیان کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اُس معنی کو واضح کرتی ہی جس کا ظاہر کرنا مقصود ہی اس معنی میں خود قرآن شریف کو بیان کہا ہے ھذا بیان للناس یعنی یہ لوگوں کے لئے معنی مقصود کو ظاہر کرنے والی چیز ہی لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنی ثم ان علینا بیانہ میں مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ بیانہ میں ضمیر خود قرآن شریف کی طرف ہی پس یہاں مراد قرآن کا بیان ہی۔ مضاف اور مضاف الیہ دو الگ الگ چیزیں ہیں جس طرح قرآن اور اس کا جمع کرنا دو باتیں ہیں۔ اور قرآن اور اس کا پڑھ دینا دو باتیں ہیں اسی طرح قرآن اور اس کا بیان دو باتیں ہیں۔ اس لئے یہاں وہ

بیان کا مفہوم

دوسرے معنی مقصود ہیں جن کو امام راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے وسمی ما یشرح به المجمل والمبهم من الکلام بیاناً نحو قوله ثم ان علینا بیانه یعنی جو چیز اجمال و ابہام والی بات کی تشریح کرتی ہے اسے بیان کہا جاتا ہے۔ اور وجہ اس کی بھی وہی ہے کہ وہ معنی مقصود کو کھول دیتی ہے اس معنی کی مثال خود امام راغب نے بھی یہی آیت زیر بحث دی ہے پس اللہ تعالےٰ نے یہاں تین کام اپنی طرف منسوب فرمائے ہیں۔ قرآن کا جمع کرنا۔ قرآن کا پڑھ دینا۔ قرآن کی تشریح یا وضاحت کرنا یہی تشریح یا وضاحت احادیث میں پائی جاتی ہے۔ رہا یہ کہ یہ کام تو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ سو یہ اسی طرح ہے جس طرح پڑھنا بھی اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کے ذریعہ سے اپنے نبی پر پڑھا تو نبی نے لوگوں پر پڑھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُسکے معنی کی وضاحت نبی پر ظاہر فرمائی تو نبی نے دوسروں پر ظاہر فرمائی ایسا ہی اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف کو نبی کے سینہ میں جمع کیا تو نبی نے دوسروں کے سینوں میں اُسے جمع کیا۔ بہر حال تین کام الگ الگ بیان کئے اور یہاں واؤ عاطفہ بھی پہلے دو میں ہے لیکن ان علینا بیانه سے پہلے واؤ نہیں کہ اُسے تفسیری کہکر پیچھا چھڑا لیا جائے بلکہ ثم سے اسے الگ کر کے ظاہر کر دیا کہ وہ الگ کام ہے÷

قرآن کریم مفصل ہے مگر مزید تشریح کی ضرورت ہے

اوپر کی عبارت میں امام راغب نے بیان کے معنی کرنے میں لفظ اجمال و ابہام کو استعمال کیا ہے اور یہ شاید بعض لوگوں کو ناگوار گزرے کیونکہ قرآن کریم اپنے آپ کو مفصل کہتا ہے۔ اور تفصیل کل شیٔ کہتا ہے سو یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے الفاظ نسبتی ہوتے ہیں۔ مولوی عبد اللہ صاحب نے قرآن شریف کے اندر مجاز اور کنایہ اس قدر مانا ہے کہ وہ اپنا سارا کام ہی اُس سے نکالتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مجاز و کنایہ اجمال ہی سے ہی ہیں۔ اور سب اہل قرآن اپنی اپنی تشریح الگ الگ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ تشریح اور وضاحت کے اصول کو باوجود قرآن شریف کو مفصل لکھنے کے اُنھوں نے بھی مانا ہے یوں تو قرآن شریف نے توریت کے متعلق بھی فرمایا ہے ثم اٰتینا موسیٰ الکتاب تماماً علی الذین احسن وتفصیلاً لکل شیٔ وھدی ورحمة (الانعام-١٥٥) جہاں حضرت موسیٰ کی کتاب یعنی تورات کو کل چیزوں کی تفصیل فرمایا ہے۔ اور ایسا ہی دوسری جگہ فرمایا وکتبنا لہ فی الالواح من کل شیٔ موعظة وتفصیلاً لکل شیٔ (الاعراف ١٤٥) یہاں بھی توریت میں ہر شئے کی تفصیل بیان فرمائی۔ پھر باوجود توریت کی موجودگی کے حضرت

داؤد کو زبور دی اور حضرت عیسیٰ کو انجیل دی۔ آخر وہ بھی بلا ضرورت نہ تھیں حالانکہ اگر کل شئ کی تفصیل توریت میں موجود تھی تو انجیل و زبور کا دینا بالکل فضول تھا۔ اہل قرآن حدیث کو اس لئے فضول ٹھہراتے ہیں کہ قرآن میں ہر شے کی تفصیل ہے لیکن اگر اس دلیل کو صحیح مانا جائے تو توریت میں تو ہر شے کی تفصیل تھی پھر انبیاء بنی اسرائیل کو کتابیں کیوں دی گئیں۔ وہ تمام کتابیں جن میں حضرت داؤد کی زبور اور حضرت عیسیٰ کی انجیل بھی ہیں اس دلیل کے رو سے نعوذ باللہ فضول ٹھہریں۔ اسی طرح ایک طرف توریت کو تفصیل کل شئ کہا اور دوسری جگہ قرآن کریم کو اُس کی اور سب کتب منزلہ کی تفصیل ٹھہرایا ہے وما کان ھذا القرآن ان یفتری من دون اللہ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین (یونس۔ ۳۷) یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے بھیجے سوا افترا کر لیا گیا ہو لیکن اُس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے موجود ہوا اور کتاب کی تفصیل ہے اس میں کچھ شک نہیں رب العالمین کی طرف سے ہے۔ پس تفصیل کا لفظ ایک نسبتی لفظ ہے۔

تفصیل کل شئ سے مراد

علاوہ ازیں تفصیل کل شئ میں دنیا کی ہر ایک چیز تو بہر حال مراد نہیں اہل قرآن نے بھی اب تک آریوں کی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ ساری دنیا کے سائنس قرآن شریف میں موجود ہیں۔ تاریخ جغرافیہ ہندسہ وغیرہ کو چھوڑو۔ دنیا کے مختلف پیشوں کا ذکر قرآن شریف میں کہاں ہے۔ دنیا کی ساری تاریخ کہاں ہے اس لئے اہل قرآن کو بھی کل شئ پر یہ قید لگانی پڑی کہ دین کی کل باتیں۔ لیکن دین تو بہت سے اصول اور بے شمار فروع پر حاوی ہے۔ مثلاً سیاست بھی دین میں داخل ہے معاشرت بھی تمدن بھی اگر یہ امور دین میں داخل نہ ہوتے تو قرآن شریف اُن کے اصول کو کیوں بیان فرماتا۔ لیکن ان ہی امور کے فروع ہزارہا باتوں پر مشتمل ہیں جن پر ایک زمانے کے اور ایک سوسائٹی کے انسان حاوی نہیں ہو سکتے۔ ان کا ذکر قرآن شریف میں کہیں نہیں ہے۔ اسی طرح گزشتہ انبیاء کے تذکروں کو بھی دین میں داخل کیا کیونکہ ان کا ذکر قرآن شریف میں کیا۔ مگر بایں یہ نہ کیا کہ تمام انبیاء کے مفصل تذکرے قرآن شریف میں کر دیئے ہوں بلکہ بعض انبیاء کی زندگی کے نہایت قلیل واقعات کا ذکر کیا اور بعض کے متعلق تو صاف فرما دیا کہ رسلاً لم نقصصھم علیک بعض رسولوں کا ہم نے تم پر کوئی ذکر نہیں کیا۔

اُنکے نام بھی قرآن شریف میں نہیں تفصیل کل شئی کس طرح ہوا ب قرآن شریف کے محاورہ کو دیکھئے ایک ملکہ کی نسبت فرماتا ہے واوتیت من کل شئی اسکو سیاسی چیزیں دی گئیں۔ اب اہل قرآن کے اصول کی رو سے ہم اس پر اس قدر حد بندی تو لگا سکتے ہیں کہ بادشاہت کے متعلق کل چیزیں اُس کو دی گئیں لیکن اس سے زیادہ نہیں جس طرح تفصیل کل شئی میں کل امور دینی مراد لیتے ہیں۔ ایسا ہی ذوالقرنین کے ذکر میں آتا ہے واٰتیناہ من کل شئی سببا ہم نے اُس کو ہر ایک چیز کے سامان عطا فرمائے۔ یہاں بھی زیادہ سے زیادہ بادشاہت کے سامان کی قید اصول اہل قرآن کی رو سے لگانی چاہئے مگر کیا یہ صحیح ہے کہ اس ملکہ کو اور ذوالقرنین کو بادشاہت کے وہ سامان یا بادشاہت کی وہ چیزیں بھی دی گئی تھیں جو آج ایک طاقتور حکومت کے ہاتھ میں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کیا یہ آہن پوش۔ یہ ۱۷۔ انچ دہانہ کی توپیں یہ ہوائی جہاز یہ مشین گنیں یہ ریلیں یہ تار یہ ٹیلیفون وغیرہ سب چیزیں اُن کو ملی تھیں ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کل شئی سے مراد صرف یہ ہے کہ اُن کو وہ ہر ایک چیز دی گئی جس کی ضرورت اُن کو دشمن کے مقابل پر تھی اسی طرح قرآن شریف تفصیل کل شئی بیشک ہے مگر اس لحاظ سے کہ جس قدر ضرورت اعدائے دین کے مقابل پر ہے جس قدر ضرورت دوسرے مذاہب کے متعلق ہے جن سے دُنیا میں اسلام کو کام پڑنا تھا یہی وجہ ہے کہ جہاں قرآن شریف کو تفصیل کل شئی کہا ہے۔ وہاں ساتھ ہی دوسرے مذاہب کا بھی ذکر ہے ما کان حدیثا یفتریٰ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شئی (یوسف ۱۱۱) یہ کوئی افترا کی ہوئی بات نہیں بلکہ جو کچھ اس سے پہلے موجود ہے اُس کی تصدیق اور ہر شئے کی تفصیل۔ اور دوسری جگہ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب فرما کر اور بھی واضح کر دیا۔ ایسا ہی افغیر اللہ ابتغی حکماً وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا (الانعام ۱۱۵) کتاب مفصل کا ذکر مخالفین کو مخاطب کر کے ہی کیا ہے اور حقیقتہً ان سب آیات میں یہ بتایا ہے جیسا کہ قرآن نے دوسری جگہ بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن شریف میں اپنی صداقت کے تمام حامی اونکی دلائل اور مخالف مذاہب کے سارے بیہودہ باطلہ اور اُن کے بطلان کے دلائل موجود ہیں۔ اور یہ فی الواقع سچی بات ہے جیسا کہ سلسلہ احمدیہ کے بانی حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے اس بات کو بارہا مخالف مذاہب کے سامنے پیش کیا۔ اور اپنے تمام دلائل کا ماخذ قرآن شریف کو ثابت کر کے دوسروں سے یہ مطالبہ کیا جس کو آج تک کسی دوسرے مذہب کا کوئی پیرو اپنی کتاب کے متعلق ثابت نہیں کر سکا۔ اس میں فی الواقع قرآن شریف کی عظمت کا کمال نظر آتا ہے کہ ملک عرب کا

ایک امی وہ کتاب دنیا میں پیش کرتا ہے جس نے نہ صرف سارے مذاہب کے اصول باطلہ کو ہی بیان کر کے اُن کی غلطی کا اظہار کیا بلکہ اس کے دلائل بھی پیش کئے۔ حالانکہ وہ ایسا شخص ہو کہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ تو ایک طرف رہا۔ وہ لکھنا پڑھنا ہی نہیں جانتا۔ اور اسی طرح تمام اصول حقہ کو بیان کر کے ان کی صداقت کے دلائل بھی بیان کرتا ہے۔ لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیٰی من حی عن بینۃ۔ غرض کہ یہ قرآن شریف کا ایک عجیب معجزہ ہے کہ یہ دعویٰ بھی خود کرتا ہے اور دلیل بھی خود دیتا ہے اور اسی کی طرف تفصیل کل شئ میں اشارہ ہے کہ وہ ہر چیز جس کی ضرورت مخالف مذاہب یا اعدائے دین کے مقابلہ میں ہو وہ اس قرآن شریف کے اندر موجود ہے۔ اس کا پیرو اس کا محتاج ہے یہ نہیں کہ دوسری کتابوں کی طرح کتاب اپنے پیروؤں کی محتاج ہو یہ پہلوں کی تصدیق بھی کرتا ہے یعنی یہ بھی سکھاتا ہے کہ فی الواقع تمام انبیاء خدا کی طرف سے آئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لئے اُن پر کتابیں اُتاریں اور ساتھ ہی ہر شے کی تفصیل بھی اُس کے اندر موجود ہے یعنی جو غلطیاں ان میں داخل ہو گئیں اُن کو بھی بتاتا ہے اور اُن کے بالمقابل صحیح اصول کو بھی بیان کرتا ہے اور دعویٰ کے ساتھ دلائل بھی خود دیتا ہے اسی لئے فرمایا فیھا کتب قیمۃ کس قدر کمال کا معجزہ ہے کہ اول یہ بتایا کہ سب مذاہب خدا کی طرف سے ہیں پھر یہ بتایا کہ اُن کی کتابوں میں تحریف ہو گئی اور مرور زمانہ سے غلطیاں داخل ہو گئیں پھر جو اصولی غلطیاں تھیں وہ بتائیں۔ پھر اُن غلطیوں کے دلائل دیئے ان واقعات پر غور کرو اور پھر تصدیق الذی بین یدیہ و تفصیل کل شئ کو پڑھو تو معلوم ہو گا۔ کہ واقعی یہ خدائے عالم الغیب کا کلام ہے اور واقعی وہ شخص بھی خدا کی طرف سے تھا جس پر اس علمی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا یہ علمی معجزہ ظاہر فرمایا۔

اصول اور فروع کا فرق ایک اور پہلو سے ہم اسی تفصیل کل شئ کے دعویٰ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے دین کے متعلق ہر معاملہ کے اصول کو بیان کر دیا ہے اور فروع میں سے بھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ نہ صرف دین اسلام کے اصول ہی یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان بلکہ سیاست تمدن معاشرت کے اصول بھی دنیا میں اختلاف مذہب کے اصولی بھی۔ اس اختلاف میں فیصلے کے اصول بھی وغیرہ۔ مگر فروع کا نہ استقصا ہو سکتا تھا۔ اور نہ اس لاحاصل کوشش کو قرآن شریف نے کیا

ہاں بطور نمونہ اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں سے بھی کچھ بیان کر دیا۔ لیکن جملہ اصول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا۔ اور پھر یہ قاعدہ بھی بتا دیا کہ فروع میں جہاں کوئی امر متشابہ پیدا ہو اصول کی طرف رجوع کر کے اُسے حل کیا جائے۔ اس لئے تفصیل کل شئ قرآن شریف ان معنوں میں بھی ہے کہ تمام اصول کی تفصیلات اس کے اندر موجود ہیں اور پوری وضاحت موجود ہے۔ وہاں کسی مزید توضیح کی چنداں حاجت نہیں۔ چنانچہ اس امر کو خود قرآن شریف نے بیان فرمایا ہے هوالذی انزل علیك الکتاب منه ایات محکمات هن ام الکتاب واُخر متشابهات خدا وہ ہے جس نے تجھ پر کتاب اُتاری اُس میں کچھ آیات محکم یعنی واضح المعنی صریح الدلالت ہیں۔ وہ کتاب کی اصل ہیں اور اور متشابہ ہیں یعنی جن کے معنی واضح نہیں۔ اب اس آیت نے صاف کر دیا کہ قرآن کریم میں بعض آیات ایسی ہیں جو واضح المعنی نہیں۔ بلکہ ان کی مزید تشریح و توضیح بکار ہے۔ پس اگر قرآن شریف ایک طرف تفصیل کل شئ بھی اپنے آپ کو کہتا ہے تو دوسری طرف اپنے اندر کچھ آیات متشابہ بھی قرار دیتا ہے۔ ہم دونوں آیتوں کو اکٹھا پڑھیں گے اور اُن میں سے ایک کے ایسے معنی نہیں کریں گے جو دوسری آیت کے خلاف ہوں اور دونوں میں تطبیق بھی درحقیقت خود اسی آیت نے کر دی ہے جو اس وقت زیر بحث ہے۔ کیونکہ یہاں ایک حصہ کو واضح المعنی صریح الدلالت فرمایا دوسرے کو ایسا نہیں فرمایا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ آیات جو واضح المعنی صریح الدلالت ہیں وہ اصول کتاب ہیں بالفاظ دیگر قرآن کریم نے اصول کو لازماً ایسے الفاظ میں بیان فرما دیا ہے کہ اُن کی مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔ مگر فروع کو ایسے رنگ میں بیان فرمایا ہے کہ اُن کی مزید توضیح کی ضرورت ہے اور یہی ایک حکیم اور پرحکمت کتاب کا کام ہو سکتا تھا کہ اصول کو نہایت پختہ اور مضبوط کر کے بیان کر دے اور فروع میں سے کچھ حصہ کو بیان کر دے کیونکہ تمام فروع کو بیان کر دینا گو خدائے عالم الغیب کی طاقت سے تو بڑھ کر نہیں۔ مگر ان تمام فروع کا برداشت کرنا ان سب کی حفاظت کرنا اور ان میں سے پھر اپنی ضرورت کے مطابق تلاش کرنا انسانی طاقت سے بالاتر تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ انسان پر وہ بوجھ ڈالے جس کی وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس طرح تو یہ قرآن کریم کروڑوں نہیں اربوں صفحوں کی کتاب بن جاتی اور کوئی اس میں سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکتا نہ اسے یاد رکھ سکتا نہ اس کی حفاظت کا سامان ہو سکتا پس کمال حکمت سے ایک طرف

اصول کو بالکل واضح اور صاف اور پختہ کر کے قرآن کریم میں ان سب کا ذکر کر دیا اور دوسری طرف فروع کے لئے اجتہاد کا دروازہ ہر زمانہ میں اُس کی ضرورت کے مطابق کھلا رکھا۔ اب چونکہ فروع ہمیشہ اصول پر عرض کی جاتی ہیں اور اصول کے مطابق ہونی چاہئیں اس لئے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سبھی کچھ بتا بھی دیا کیونکہ جب ایک چیز کے علم حاصل کرنے کا ذریعہ بتا دیا۔ تو گویا اُس کا علم ہی دے دیا اور اس لحاظ سے یعنی مجاز کے رنگ میں تفصیل کل شیء قرآن شریف اس معنی میں بھی ہے کہ اس میں سب چیزوں کا علم دے دیا کیونکہ سب چیزوں کے علم حاصل کرنے کا رستہ بتا دیا۔ چنانچہ اس آیت میں خود ہی اس قاعدہ کی توضیح بھی فرما دی وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا بہ کل من عند ربنا۔ اور اس کی (یعنی متشابہ کی) تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ اور مضبوط علم والے وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے یعنی متشابہ کے معنی راسخ فی العلم لوگ اسی اصول پر معلوم کرتے رہیں گے کہ وہ سب کو اپنے رب کی طرف سے جانتے ہیں۔ راسخ فی العلم اُن کو اس لئے کہا کہ وہ ایک مضبوط بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بنیاد یہی ہے کہ وہ محکم اور متشابہ دونوں کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں اور محکم کے معنی تو ظاہر ہیں سو جس کے معنی میں کسی قسم کی بحث نہیں۔ متشابہ کو اس پر عرض کرنا خود ایک مضبوط بنیاد پر کھڑے ہونا ہے پس یہ وہ قاعدہ ہے جو خود قرآن کریم نے تجویز فرمایا۔

قرآن کریم میں متشابہات کی حکمت اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصول جو قرآن کریم نے اوپر بتایا ہے ساری مشکلات کو حل کر دیتا ہے قرآن شریف میں ایک رنگ میں سبھی کچھ موجود ہے مگر نہ اس طرح جیسے لفظ پرستوں نے خیال کر لیا ہے۔ ہاں بیج کے طور پر اس میں سب کچھ ہے اور اس بیج کو درخت بنانے کی طاقت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے۔ متشابہ آیات کو صرف اسی قدر نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اُن کے معنی میں وضاحت نہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ متشابہ آیات وہ ہیں جو بہت سے معنی کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ اور ایک طرف اگر آیات محکم نے دنیا پر یہ احسان کیا کہ اصول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے تاکہ اُن کے متعلق شک و شبہ کی گنجایش باقی نہ رہے۔ تو دوسری طرف متشابہ آیات کا کوئی کم احسان دنیا پر نہیں اس لئے کہ اُن کے اندر وہ ذخائر علم بھرے پڑے ہیں جن سے آخر تک دنیا تمتع ہوتی رہے گی۔ وہ ذخائر علم بیشک اپنی خوراک ان اصول سے ہی حاصل کرتے ہیں جس طرح

ایک درخت کی شاخیں غذا اپنی جڑھوں کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہیں۔ مگر بجائے خود وہ اس درخت میں جس نے دنیا کے آخر تک قائم رہنا تھا ایسے قدر ضروری عنصر ہیں جس قدر ضروری کہ محکمات ہیں اگر یہ قدرتی تقسیم قرآن شریف کے اندر نہ ہوتی جو اللہ کا آخری کلام شریعت وہدایت تھا۔ تو وہ صحیفہ قدرت کے مطابق نہ ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے یہی چاہا کہ جو قانون اُس کی اس کتاب میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جو اُس کے ہاتھوں سے بنائی ہو بعینہ وہی قانون اُس کی اس کتاب میں بھی کام کرتا ہوا نظر آئے جو اُس کے مُنہ کا کلام ہو۔ اور چونکہ یہ کمال اس کتاب میں ظاہر کرنا مقصود تھا اس لئے جس قدر قرآن کریم نے بار بار نظارہ قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے کسی الہامی یا غیر الہامی کتاب نے اس قدر توجہ نہیں دلائی ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب کے رنگ کی آیات اگر کوئی جمع کرنا چاہے تو سیکڑوں آیتیں قرآن شریف میں ملیں گی پس جس طرح ایک مضبوط جڑوں کے درخت کے ہمیشہ نئے سے نئے پتے نکلتے رہتے ہیں اسی طرح تا قیامت قرآن شریف سے نئے سے نئے علم پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر ایک قسم کی ضروریات کو وہ پورا کرتا رہے گا مگر وہ بطور ایک اصل کے ہوگا اور اس سے ہر قسم کی فروع پیدا ہوتی رہینگی محکم اور متشابہ آیات اپنا اپنا کام کرتی رہینگی اور یوں دنیا کیلئے آخر تک روحانی غذا کے پیدا کرنے کا موجب ہوتی رہیں گی۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس میں کل فروع کا احاطہ فوری رنگ میں پائے وہ خدا کے کلام سے وہ توقع رکھتا ہے جو اُس کے قانون کے خلاف ہے اور وہ نہ صرف قرآن کریم سے ہی ناواقف ہے بلکہ عقل انسانی سے بھی کام نہیں لیتا ۔

باریکیوں کو اخذ کرنے والوں کے مدارج کا اختلاف

اس تمام بحث کو پڑھ لینے کے بعد کسی شخص کو اس سے انکار کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ کہ قرآن کریم کی آیات کی مزید تفصیل و تشریح کی بھی ضرورت ہے اور ان لوگوں نے بھی اپنے عمل سے اس کا اعتراف کیا ہے جنہوں نے اپنے قول سے اس کی تردید کی تھی میں نے اوپر اللہ تعالیٰ کے اسی قولی کتاب کا اُس کی فعلی کتاب سے مقابلہ کیا ہے اور اسی کو ذرا اور کھولا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب یعنی اُس کی مخلوقات میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یوں تو وہ سب کے سامنے کھلی پڑی ہے لیکن اُس کو دیکھنے میں سب یکساں نہیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اُس کے موٹے سے موٹے واقعات کو نہیں دیکھتے اور آنکھیں رکھتے ہوئے آنکھیں بند کرکے اُس کے نشانات سے گزر جاتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ مخلوقات سماوی و ارضی کے اندر ایک باریک

نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر فکر کرنے کی عادت رکھتے ہیں وہ پہلوں سے بہت زیادہ باریکیاں اس کھلی ہوئی کتاب میں سے اخذ کر سکتے ہیں۔ ان سے آگے ایک گروہ علم دانوں کا ہے۔ جنھوں نے اپنی باریک نگاہ سے قانون قدرت کی بعض باریکیوں کو ایسا اخذ کر لیا ہے کہ وہ اُن چیزوں کو دیکھتے ہیں جن کو عام نگاہ نہیں دیکھ سکتی اور اُن طاقتوں کو اپنے کام میں لاتے ہیں جن کو دوسرے نہیں لا سکتے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک گروہ سائنس دانوں کا ہے جو خوردبین کی مدد سے ایسی ایسی مخفی باتوں کو دیکھ لیتے ہیں جن کو نہ صرف انسان کی چشم بینا ہی نہیں دیکھ سکتی بلکہ وہاں تک فکر و عقل کی بھی رسائی نہیں یہی نظارہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی قولی کتاب یعنی قرآن شریف میں نظر آتا ہے یعنی بہتیرے لوگ ہیں جو اس کو پڑھتے ہیں مگر اُس کی موٹی موٹی باتوں سے بھی بیخبر رہتے ہیں بعض پڑھتے ہیں اور اُس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور اُس کی بہت سی باریک باتوں تک اُن کی نگاہ جاتی ہے اس سے اوپر ائمہ مجتہدین نبی کا فہم وحی خفی ہے کا گروہ ہے جو فکر و تدبر سے کام لے کر اجتہاد کر کے اور بہت سے باریک مسائل کو قرآن شریف سے اخذ کرتے ہیں لیکن نبی کو جس پر وہ کلام نازل ہوتا ہے وہ خوردبین عطا کی جاتی ہے جس کی مدد سے وہ وہ کچھ دیکھتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ اور بہت سی باتیں جو کتاب اللہ میں ایک بیج کے رنگ میں موجود ہیں نبی اپنے اُس فہم سے جو اللہ تعالیٰ اُسے خاص طور پر عطا کرتا ہے اُنہیں درخت کی صورت میں دیکھ لیتا ہے۔ وہ روشنی جو اُس کو دی جاتی ہے وہ معمولی اجتہاد سے بالاتر اور زیادہ تیز روشنی ہوتی ہے۔ اسی کو وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہے کہ جس قلب پر وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے اُس کو اس کا خاص فہم بھی ملنا ضروری ہے کیونکہ وہ اُس کو دوسروں کی طرح باہر سے نہیں دیکھتا بلکہ اندر سے دیکھتا ہے۔ اُس کے قلب میں جبتک ایک خاص نور پیدا نہیں کیا جاتا اُس وقت تک وہ اُس وحی کو لینے کے قابل کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ صاف بتاتا ہے کہ وحی الٰہی پانے کا ہر ایک قلب سزاوار نہیں ہوتا پس یہی نور جس کی وجہ سے اس کا قلب مہبط وحی بنتا ہے۔ اُس کو ایک خاص فہم عطا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اور اُسی خاص فہم سے کام لے کر یا وحی خفی کی مدد سے وہ اُن امور دینی میں فیصلہ کرتا ہے جن کی وضاحت کتاب اللہ نے نہیں کی۔ اور اس وجہ سے کہ اُس کو خاص فہم منجانب اللہ عطا ہوتا ہے اور خاص روشنی ملتی ہے وہ خاص اختیارات رکھتا ہے۔ اس کا فیصلہ

اُمت کے لئے ایک قطعی فیصلہ ہوتا ہے۔ اجتہاد میں غلطی کا امکان ہے۔ مگر اُس کے فیصلۂ دینی میں غلطی کا امکان نہیں۔ مثلاً قرآن شریف میں صلوٰۃ کا حکم ہوتا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بتا دیتے ہیں کہ صلوٰۃ یہ ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے۔ وہ غلط ہو یا قرآن شریف یا اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہو۔ اور کسی دوسرے شخص کو معلوم ہو جائے کہ وہ نماز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھی وہ درست نہیں بلکہ قرآن شریف ایک دوسری طرز کی نماز چاہتا ہے۔ ایک فیصلہ دینی اگر قطعی طور پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو اُس کا قبول کرنا سب اُمت کے لئے ضروری ہے۔

نبی کو خاص فہم دیا جاتا ہے

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا قرآن شریف سے یہ ثابت ہے کہ نبی کو کوئی خاص فہم عطا ہوتا ہے؟ جس سے وہ امور دینی میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ بلاشبہ ایسا ثابت ہوتا ہے اور قرآن کریم کی متعدد آیات اس پر گواہ ہیں۔ یوں تو کسی نبی کے متعلق فرمایا ولوطاً اٰتینٰہ حکما و علما کسی کے متعلق فرمایا ففررت منکم لما خفتکم فوھب لی ربی حکما و جعلنی من المرسلین یا فرمایا و لما بلغ اشدہ و استوی اٰتینٰہ حکما و علما لیکن جامعیت کے رنگ میں ایک جگہ کوئی اٹھارہ انبیا کے نام لے کر فرمایا اولٰئک الذین اٰتینٰھم الکتاب والحکم والنبوۃ الانعام ۸۹۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور فیصلہ کرنے کا اختیار اور منصب سفارت (اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان) عطا فرمایا ہے اور دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ عام الفاظ میں فرمایا ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ (آل عمران ۷۸) یہ کسی بشر کو شایاں نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور فیصلہ کرنے کا اختیار اور منصب سفارت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔ حکم کے معنی امام راغب نے ان الفاظ میں کئے ہیں ان یقضی بشیء علی شیء فیقول ھو کذا اولیس بکذا یعنی ایک چیز کا دوسرے پر فیصلہ کیا جائے۔ پس وہ فیصلہ کرنے والا کہے یہ ایسا ہے اور ایسا نہیں۔ پس ان آیات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جہاں اپنے مرسلین کو کتاب دیتا ہے منصب سفارت عطا فرماتا ہے وہاں اُن کو حکم یعنی فیصلہ کرنے کی قوت یا فیصلہ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ انبیا سب بادشاہ نہیں ہوتے پس یہ فیصلہ صرف امور دینی میں ہی فیصلہ ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ حکم کے معنی لغت میں العلم والفقہ یعنی علم و فقاہت بھی لکھے ہیں۔ مگر ظاہر ہے

کہ فیصلہ کرنے کی قوت یا اختیار کے لئے علم وفقاہت بھی بکار ہے اور صحیح حکم یا فیصلہ چونکہ فقاہت سے ہی پیدا ہوتا ہی۔ اس لئے نبی کو حکم عطا کرنے میں دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں یعنی اس کو خاص فہم بھی دیا جاتا ہے اور فیصلہ کرنے کا اختیار بھی دیا جاتا ہے اس لئے بعض وقت یہ صرف فہم کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے یعنی حکمت کے معنی ہیں۔ مگر ظاہر ہی کہ کتاب اور نبوت کے ساتھ انبیا کو جو حکم عطا کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد اختیار فیصلہ ہی ہے۔ یا کتاب کا وہ فہم جس سے وہ امور دینی میں فیصلہ کرسکتے ہیں معمولی فہم مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کا تعلق نبوت سے کیا ہی یہ کوئی خاص بات ہے جو انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوتی ہے جس طرح اتیناہ حکماً وعلماً میں علم سے مراد خاص علم ہے جو امور دینی کے متعلق منجانب اللہ دیا جاتا ہی۔ ورنہ علم تو کم وبیش ہر ایک انسان کو دنیا میں ملتا ہی اور خدا کی طرف سے ہی ملتا ہی۔ یہاں تک کہ جو شخص لکھنا سیکھتا ہے وہ بھی منجانب اللہ ہی علم لیتا ہے جیسا فرمایا لایاب کاتب ان یکتب کما علمہ اللہ ان یکتب کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے نکار نہ کرے۔ جیسا کہ اللہ نے اُسے لکھنا سکھایا یا شکاری جانوروں کو شکار کرنا سکھانا یہ بھی علم اللہ ہی دیتا ہے حالانکہ اس کا دین سے کچھ بھی تعلق نہیں جیسے کہ فرمایا وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونھن مما علمکم اللہ اور وہ جو تم شکاری جانوروں کو سکھاتے ہو یعنی شکار کرنا سکھاتے ہو۔ تم اُن کو سکھاتے ہو اُس سے جو اللہ نے تم کو سکھایا۔ پس گو خدا کا انسان کو علم دینا نہایت وسیع ہے مگر جب وہ نبی کے متعلق فرماتا ہے کہ اُس کو ہم نے علم دیا تو اس سے مراد وہ عام علم نہیں جو انسان اپنی کوشش سے سیکھ لیتا ہی۔ گو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اسباب سے اور اسی کی پیدا کردہ طاقتوں سے وہ سیکھتا ہے وہ بھی خدا کا ہی دیا ہوا علم ہے)۔ بلکہ اس سے مراد وہ علم خاص ہی جو انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اسی طرح حکم سے مراد وہ معمولی فہم یا دنیا کے قضایا میں فیصلہ نہیں ہوسکتا جس میں دوسرے انسان اُن کے شریک حال ہیں بلکہ یہ وہ خاص فہم ہے جو وحی خفی سے ملتا ہے جس میں دوسرے انسان ان کے شریک حال نہیں اور یہ وہ اختیار فیصلہ ہے جو دینی امور میں ان کو دیا جاتا ہی جس میں دوسرے انسان اُن کے شریک نہیں۔ پس یہ آیات قرآنی اس بات کا قطعی فیصلہ کرتی ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام کو امور دینی میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہی اور ایسا فیصلہ کرنے کے لئے اُنہیں خاص فہم دیا جاتا ہی

جسے وحی خفی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ معمولی فہم انسانی سے ایک الگ روشنی ہے +

نبی کو امور دینی میں فیصلہ کرنے کا اختیار

اس بات پر کہ نبی کو امور دینی میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے جس کو اصولی اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ کہ حکم تو اللہ کے لئے خاص ہے۔ ان الحکم الا للہ نہیں حکم مگر اسی کے لئے ولا یشرک فی حکمہ احدا۔ اور اپنے حکم میں وہ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ایسا ہی اور بھی بہت سی آیات ہیں وما اختلفتم فیہ من شئی فحکمہ الی اللہ۔ واللہ یحکم لا معقب لحکمہ۔ فالحکم للہ العلی الکبیر تحقیق ہے کہ ان آیات سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اللہ تعالے کسی دوسرے کو دنیا میں حاکم بننے کی یا حکم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آیات قرآنی کے وہ معنی کرنا جو صریحاً خلاف واقعات ہوں عقلمندی نہیں۔ دنیا میں حاکم بھی بنتے ہیں حکم دیتے بھی ہیں چلاتے بھی ہیں۔ مگر جلد بازی سے اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ امور دینی میں کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ جائے غور ہے کہ قرآن نے امور دینی کی قید کوئی نہیں لگائی ان الحکم الا للہ میں امور دینی کی کوئی قید ہے ولا یشرک فی حکمہ احدا میں امور دینی کی کوئی قید ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت کوئی حکم دینا شرک ہے۔ تو خواہ ایسا حکم دنیا سے تعلق رکھتا ہو یا دین سے بات یکساں ہے حکم میں شریک تو ہو گئے اور اگر یہ شرک نہیں۔ تو پھر تمام آیات کے مفہوم کو ان الحکم الا للہ پیش کر کے بگاڑتے چلے جانا۔ فی قلوبھم زیغ کا مصداق نہیں تو اور کیا ہے۔ اصل بادشاہ دین و دنیا دونوں کا خدا ہی ہے۔ اور کچھ قوانین کے ماتحت جو اس نے بعض کو بعض کے ماتحت رکھا ہے اور اُن کا حکم ماننے کو کہا ہے تو اس کو شرک فی الحکم قرار دینا سوائے اس کے نہیں ہو سکتا کہ انسان عقل و فکر سے کام نہ لے۔ مثلاً کم از کم یہ تو مولوی عبداللہ صاحب کو بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امور سلطنت میں اولی الامر کی اطاعت یعنی اُن کا حکم ماننے کا حکم دیا ہے پس اگر وہ خود حکم دے کہ فلاں کی بات بھی مان لیا کرو تو یہ بھی اُسی کا حکم ہوا۔ امور سیاست دین سے الگ نہیں۔ اگر یہ الگ ہوتے اگر یہ ہمارے دین کا جزو نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کیوں اولی الامر یعنی بادشاہوں کی اطاعت کا حکم دیتا۔ غرض یہ بات نہایت صاف ہے۔ بادشاہوں کی اطاعت کا حکم دینا صاف بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی دین کا ہی حصہ رکھا ہے اور باوجود سیاست کو دین کا حصہ رکھنے کے پھر بھی حکم دیا ہے کہ بادشاہوں کی اطاعت کرو۔ اور پھر لا یشرک فی حکمہ احدا میں کوئی قید امور دینی کی نہیں ہے، پس جس طرح امور سیاسی میں بادشاہوں کی اطاعت شرک فی الحکم

نہیں اسی طرح کسی امر میں انبیأ علیہم السلام کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں دوسرے کو شریک کر دیا۔ نہیں بلکہ ہم تو اللہ کے حکم کے ماتحت ہی اس کا حکم مانتے ہیں پس حق یہی ہوا کہ حکم تو پھر بھی صرف خدا کا ہی رہا۔ اور کوئی شخص شریک فی الحکم نہ ہوا۔

حکم کے ماتحت حکم اس کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے افغیر اللہ ابتغی حکما کیا میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا حکم چاہوں یعنی فیصلہ کرنے والا لیکن دوسری جگہ خود ہی فرماتا ہے کہ میاں بی بی میں جھگڑے کے وقت یوں کیا کرو فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا۔ ایک حکم مرد کے گھر والوں سے اور ایک حکم عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو۔ اب اشتراک لفظی کو دیکھئے۔ ایک طرف حکم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو حکم بنانا جائز نہیں دوسری طرف ایک معمولی خانگی جھگڑے میں حکم ہوتا ہے کہ دو حکم مقرر کرو۔ اگر وہی طریق استدلال ہے جو ہمارے اہل قرآن کہلانے والے دوست اختیار کرتے ہیں کہ جب حکم اللہ کے لئے خاص ہے تو کسی اور کا حکم ماننا شرک ہے تو اللہ کے سوائے دوسرے کو حکم بنانے کی تعلیم دے کر پھر کیا قرآن نے خود شرک سکھایا؟ حکم وہ بھی ہیں مگر اصل حکم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فیصلہ ان کا بھی بالضرور قبول کرنا ہوگا اسی لئے ان کو حکم کہا ہے مگر چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت حکم بنتے ہیں۔ اس لئے یہ شرک نہیں امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ ان کو کیوں حکم کیا اور حاکم نہیں کہا تنبیہا انّ من شرط الحکمین ان یتولیا الحکم علیھم یعنی یہ بتانے کے لئے کہ حکم کی شرط یہ ہے کہ وہ ان پر حکم کا متولی ہوتا ہے حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے فیصلہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم ہی کہا ہے وداؤد وسلیمان اذ یحکمٰن فی الحرث اذ نفشت فیہ غنم القوم وکنا لحکمھم شاھدین ففھمنٰھا سلیمان وکلا اٰتینا حکما وعلما اور داؤد اور سلیمان جب کھیتی کے بارے میں فیصلہ کرتے تھے جب رات کے وقت اس میں لوگوں کی بکریاں جا پڑیں اور ہم ان کے حکم کے گواہ تھے پس ہم نے سلیمان کو سمجھا دیا اور دونوں کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا اب ان الحکم الا للہ بھی درست ہوا یعنی حکم اللہ کے سوائے کسی کا نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ داؤد اور سلیمان دونوں کو حکم یا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا تھا خواہ وہ کسی معاملہ میں ہو مگر حکم ہی تھا۔ یہ بھی شرک نہیں۔ کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا حکم دینا خلاف منشائے قرآن کریم نہیں بلکہ عین اس کے

منشاء کے مطابق ہو۔ اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا حکم بننا بھی خلاف منشائے قرآن کریم نہیں ۔

قرآن میں اطاعت رسول کا ذکر

اب جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ خود کسی دوسرے کا حکم ماننے کا حکم دے تو وہ لا یشرك فی حکمه احدا۔ اور ان الحکم الا للہ کے خلاف نہیں۔ تو ہم ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا یا آپ کے حکم ماننے کا یا آپ کو حکم بنانے کا حکم دیا ہے۔ ایسی کسی آیت کے خلاف اب یہ دلیل پیش نہ ہو سکے گی کہ اس آیت کے ایسے معنی کرنا خلاف قرآن ہے کیونکہ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت دوسرے کے حکم کے ماننے کو جائز رکھتا ہے قرآن شریف میں ایسی آیات جنہیں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا کھلے الفاظ میں ذکر ہے بیس ہیں۔ اور مختلف الفاظ میں یہ ذکر موجود ہے پہلے میں ان آیات کو لکھ دیتا ہوں۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء ۸۰) ومن یطع اللہ و الرسول (النساء ۶۹) ومن یطع اللہ ورسولہ (النساء ۱۳۔ النور ۵۲۔ الاحزاب ۳۳۔ الفتح ۱۷) ویطیعون اللہ ورسولہ (التوبہ ۷۱) وان تطیعوا اللہ ورسولہ۔ (الحجرات ۱۴) قل اطیعوا اللہ والرسول (آل عمران ۳۳) یایہا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (النساء ۵۹۔ محمد ۳۳) یایہا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ (الانفال ۲۰) قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (النور ۵۴) واطیعوا اللہ والرسول (آل عمران ۱۳۳) واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (المائدہ ۹۳۔ تغابن ۱۳) واطیعوا اللہ ورسولہ (الانفال ۱۔ ۴۷۔ المجادلہ ۱۴) واطیعوا الرسول (النور ۵۷) اور بارہ آیات ایسی ہیں جن میں دوسرے انبیاءؑ نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اُمتوں کو اپنی اطاعت کی طرف بلایا ہے اور وہ الفاظ عموماً ایک ہی ہیں یعنی فاتقوا اللہ واطیعون۔ جو حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آل عمران ۵۱۔ اور الزخرف ۶۴ میں اور حضرت نوح کے متعلق الشعراء ۱۰۸، ۱۱۰۔ اور نوح ۴ میں (یہاں فاتقوا اللہ کی جگہ فاعبدوہ ہے) اور حضرت ہود کے متعلق الشعراء ۱۲۶۔ ۱۳۲ میں اور حضرت صالح کے متعلق الشعراء ۱۴۴، ۱۵۱ میں اور حضرت لوط کے متعلق الشعراء ۱۶۳ میں اور حضرت شعیبؑ کے متعلق الشعراء ۱۷۹ میں۔ اور حضرت ہارون کے متعلق طٰہٰ ۹۱ میں یہ لفظ ہیں ولقد قال لھم ھارون من قبل۔۔۔۔۔

فاتبعونی واطیعوا امری اور ہارون نے انہیں پہلے سے کہدیا تھا..... سو تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی فرمانبرداری کرو۔ اور ایک مرتبہ کل رسولوں کے متعلق عام قاعدہ بتا دیا وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ النساء ۶۴ یعنی ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اسی طرح نبی کریم صلعم کو حکم بنانے کا حکم بھی موجود ہے فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (النساء ۶۵) نہیں میرے رب کی قسم ہرگز ایمان نہیں لاتے یہاں تک کہ تم کو حکم بنائیں اس میں جو ان میں جھگڑا ہو پھر اپنے دلوں میں اس کے بارہ میں کوئی تنگی نہ پائیں جو تو فیصلہ کرے اور کامل فرمانبرداری سے قبول کریں آپ کا حکم ماننے کے متعلق اور بھی آیات ہیں جیسے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران ۳۱) کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اور اللہ تم سے محبت کرے گا اور لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب ۲۱) تمہارے لئے اللہ کے رسول میں نہایت عمدہ نمونہ ہے یعنی آپ کے نقش قدم پر چلو۔ بالفعل میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ انہی آیات میں کافی سے زیادہ وضاحت موجود ہے۔

مولوی عبداللہ کی اطاعت رسول کی تفسیر

بظاہر یہ اس قدر قوی اور صریح ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ہے کہ اس قدر متواتر احکام کی موجودگی میں کسی شخص کا آپ کی اطاعت سے انکار کرنا خود انکار قرآن مجید ہے۔ مگر اہل قرآن کہلانے والے لوگ اس قدر صریح آیات قرآنی کا انکار کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ ان کے انکار کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔ اول "سارے قرآن مجید میں جس جگہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول آوے وہاں سب جگہ مراد صرف کتاب اللہ المجید ہی ہوتی ہے" کیونکہ لغت عرب میں رسول بمعنی رسالت بھی آیا ہے۔ اور چونکہ ان الحکم الا للہ اور لا یشرک فی حکمہ احدا کے ماتحت کسی اور کا حکم ماننا شرک ہے اس لئے اطیعوا الرسول میں الرسول سے مراد رسالت ہے اور رسالت سے مراد قرآن مجید ہے۔ دوئم جہاں لفظ اطیعون آیا ہے اور جہاں یطاع باذن اللہ ہے وہاں مراد اطاعت سے موافقت ہے۔ کیونکہ اطاعت کے معنی لغت عرب میں موافقت بھی آئے ہیں پس فاتقوا اللہ واطیعون کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کا تقویٰ کرو یعنی میرے خیال کی موافقت کرو یعنی جس طرح میں اللہ سے ڈرتا ہوں اسی طرح تم

ذرو۔ سوئم واطیعوا امری ہیں۔ امر سے مراد حکم نہیں بلکہ حال وعمل وچال چلن معنی ہیں
پس فاتبعونی واطیعوا امری کے معنی ہوئے سو تم میری پیروی کرو یعنی میرے چال چلن میں
میرے ساتھ موافقت کرو۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ لفظ رسول اور اطاعت اور امر کا اور حرف
عطف و کا مفہوم مولوی عبداللہ صاحب وہ نہیں لیتے جو مفسرین قرآن نے عام طور پر
لیا ہے بلکہ اُن کے معنی کچھ اور لیتے ہیں اور اس تمام اختلاف معنی کی وجہ صرف ایک ہی ہے
کہ قرآن شریف میں چونکہ لا یشرک فی حکمہ احدا اور ان الحکم الا للہ آیا ہے اس لئے
کسی دوسرے کا حکم مانا نہیں جا سکتا۔ بلکہ کسی دوسرے کا حکم دینا یا اُس کا ماننا دونوں
شرک ہیں پس جب حکم نہیں تو فرمانبرداری کیسی لیکن چونکہ میں یہاں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ
خدا کے حکم کے ماتحت کسی دوسرے کا حکم دینا ان الحکم الا للہ اور لا یشرک فی حکمہ
احدا کے خلاف نہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم نے خود لفظ حکم۔ اور حُکم استعمال کر کے دکھا دیا
پس مولوی صاحب کے ظاہر معنی سے انحراف کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور نہ تاویلات بعیدہ
ورکیکہ کو کام میں لانے کی کوئی گنجایش ہے جب قرآن شریف دوسرے کے حکم کو اللہ تعالے
کے حکم کے ماتحت جائز رکھتا ہے تو اصل میں جس بات سے غلط فہمی پیدا ہوئی تھی وہ دور
ہو گئی اور ان آیات کے ظاہر معنی کی رو سے رسول اللہ صلعم کی اطاعت ضروری ٹھہری
اور مولوی عبداللہ صاحب کی ساری بحث کا فیصلہ اس ایک بات پر ہی ہو جاتا ہے ✦

واؤ کی تفسیر مبہم ہے

لیکن میں مولوی صاحب کے معنی کو لے کر دکھاتا ہوں کہ یہ معنی خود بھی کسی طرح پر
قابل قبول نہیں اوپر کے قریباً تیس مقامات میں مولوی عبداللہ صاحب نے
واؤ کو تفسیری ٹھہرا کر معنی کئے ہیں۔ مولوی صاحب کے نزدیک جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اطیعوا
اللہ ورسولہ۔ یطیعون اللہ ورسولہ۔ اطیعوا اللہ ورسولہ یا اس قسم کے لفظ فرمائے
ہیں وہاں اللہ کی اطاعت کی تفسیر رسولہ سے کر کے یہ بتایا کہ اللہ کی اطاعت سے اس
کے رسول یعنی اُس کے پیغام یعنی قرآن شریف کی اطاعت مراد ہے۔ اول سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ کیا اللہ کی اطاعت کوئی ایسا مبہم امر تھا کہ اُس کی تفسیر کی ضرورت پیش آئی اللہ کی
اطاعت ایک ایسا صاف اور سیدھا جملہ ہے کہ موٹی سے موٹی عقل کے انسان کو بھی اس کے
سمجھنے میں کوئی دقت نظر نہیں آتی۔ کسی کی اطاعت یہی ہے کہ جو وہ حکم دے وہ مان لیا جائے
جس امر کی تفسیر کی ضرورت نہ ہو اُس کی تفسیر قرآن شریف کرنے لگے یہ عجیب معاملہ ہے اس

معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن شریف اب ساری لغت کو بھی خود بیان کرے۔ کوئی شخص جس کے دل میں قرآن کی عظمت ہے اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ ایک جملہ جس کے معنی سمجھنے میں کسی کو دقت نظر نہیں آتی اُس کی تفسیر خود قرآن شریف کرے دوسرا سوال یہ ہے کہ تفسیر تو ایک آدھ دفعہ کر دینا کافی تھا اس کے کیا معنی کہ جب اطیعوا اللہ کا حکم دیا۔ ساتھ ہی تفسیر بھی شروع کر دی۔ اس سے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی ایسا گول مول فقرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تفسیر نہ کرتا تو شاید لوگ اُس کے کچھ کے کچھ معنی سمجھ لیتے اس لئے ایک دو دفعہ تفسیر کر دینا کافی نہیں سمجھا بلکہ برابر سالوں تک جب اطیعوا اللہ کا حکم دیا ساتھ ہی اُس کی تفسیر شروع کر دی۔ کیا اس کی کوئی اور مثال بھی قرآن شریف میں ہے کہ بار بار جب ایک حکم دیا جائے تو ساتھ ہی اُس کی تفسیر بھی بتا دی جائے اور کبھی بھی اس کو بغیر تفسیر کے بیان نہ کیا جائے تیسرا سوال یہ ہے کہ تفسیر ہمیشہ ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جو پہلے لفظ کے ابہام کو دور کر دے اور ابہام کو دور کرنے کا نام ہی تفسیر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بقول مولوی عبداللہ صاحب اللہ کی اطاعت کا مفہوم مبہم ہے اور رسول کی اطاعت کے لفظ نے اسے واضح کر دیا۔ گویا اللہ کے لفظ میں ابہام ہے اور رسول کے لفظ میں نہ صرف کوئی ابہام نہیں بلکہ وہ اس قدر واضح ہے کہ جو ابہام اللہ کے لفظ میں تھا اس نے اُسے بھی دور کر دیا۔ اور دوسری طرف مولوی صاحب کی ساری بحث کا دارومدار اس بات پر ہے کہ لفظ رسول کے دو معنی لغت عرب میں آتے ہیں۔ یعنی ایک پیغامبر دوسرے پیغام۔ تو جس لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں یقیناً اُس میں ابہام ہے۔ اس کے خلاف اللہ کے دو معنی آج تک تو روئے زمین پر کسی نے کئے نہیں۔ اب شاید اہل قرآن کے بہادر فرقہ میں سے کوئی اپنے پیش رو کی عزت بچانے کے لئے کر دے تو کر دے تو پس یوں کہنا چاہیئے کہ لفظ اللہ کی تفسیر جس کے معنی ایک کے سوا دوسرے ہو ہی نہیں سکتے اور نہ کبھی کسی نے فرضی طور پر بھی کئے ہیں قرآن شریف نے جسے پر حکمت کتاب ہونے کا دعویٰ ہے ایک ایسے لفظ سے کی ہے جس کے معنی میں اتنا بڑا ابہام ہے کہ تیرہ سو سال تک سارے مفسرین اور سارے کے سارے علماء و لغت دان اس کے غلط معنی مراد لیتے رہے۔ اور تیرہ سو سال میں اس اُمت میں سے ایک شخص کو بھی صحیح معنی معلوم نہ ہوئے العجب ثم العجب۔ کیا ایسی پر حکمت تفسیر دنیا میں کوئی اور بھی ہے کہ کروڑ در کروڑ انسانوں میں سے جو اصل لفظ کو خوب سمجھتے ہیں جس میں کوئی ابہام قطعاً

نہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ ایک بھی انسان اس تفسیر کو نہ سمجھے۔ واضح لفظ کی تفسیر مبہم لفظ سے
کرنا یہ تو قرآن کریم جیسی مفصل و مشرح کتاب کا کمال ہوا جس کی شان میں مولوی عبداللہ صاحب
یوں رقمطراز ہیں اس میں مجملہ احکام و تمام مسائل دین اسلام کے بارہ میں مباح تک
بھی ہر طرح کامل مکمل مفصل و مشرح کافی شافی وافی عافی ہوتی ہو ان کے کسی مسئلہ میں اجمال
و اشکال نہیں ہوا اگر یہ چوٹی کا مسئلہ باوجود بیس مرتبہ تشریح کرنے کے ایسا مجمل و
مشکل ہوا کہ تیرہ سو سال تک جس قدر لوگوں نے اس کا مطلب سمجھا غلط ہی سمجھا صحیح مطلب کا
نام و نشان تک ان ہزاروں تصانیف میں نظر نہیں آتا جو اس عرصہ میں اہل اسلام نے لکھیں۔
"کامل مکمل مفصل مشرح کافی شافی وافی عافی کوئی کتاب ہو تو ایسی ہی ہو کہ سارے کمال و
تکمیل اور تفصیل و تشریح کے ساتھ جو کافی شافی وافی عافی بھی اصل مطلب کا پتہ تک لگنے
نہیں دیا اور آج مولوی عبداللہ صاحب کو اس تفصیل و تشریح کا پردہ اٹھانا پڑا۔ انا للہ
وانا الیہ راجعون۔ کیا یہ قرآن کریم کی عظمت ہو جس پر اس قدر زور دیا جاتا ہو۔ مگر
نہیں غلط خیالات کی پیروی سے انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ واضح لفظ کی تشریح
مبہم لفظ سے کرنا ایک ایسی بیہودگی ہے کہ جسے کوئی قرآن شریف کی ادنیٰ عظمت بھی دل
میں رکھنے والا اس پاک کتاب کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ کاش یہ اہل قرآن کا گروہ
کچھ کام اپنی عقل و فکر سے اور اس ناپاک خیال کو اپنے دل سے دھکے دے کر نکال
دے۔ اگر کوئی غور کرے تو یہ ایک بات ہی ساری بحث کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہو۔ اس
کے متعلق ایک جگہ تو مولوی عبداللہ صاحب نے کمال ہی کر دیا ایک جگہ قرآن شریف میں
آتا ہے واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول (النساء - ۶۱) اور جب ان کو
(یعنی منافقوں کو) کہا جاتا ہے آؤ اس کی طرف جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف۔
مولوی صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں "جب کہا جائے ان کو آؤ اس کتاب اللہ کی طرف
جو اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے یعنی اس کے بھیجے ہوئے قرآن مجید کی طرف" گویا ما انزل
اللہ سے تو ان کو پتہ نہ لگتا تھا کہ خدا تعالیٰ کس چیز کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن الرسول سے
اس کی تفسیر ہو گئی۔ کوئی خدا کے لئے غور کرے کہ یہ کیا ہنسی قرآن شریف کے ساتھ ہو رہی
ہے کہ ما انزل اللہ ایسے صاف واضح لفظ کی بھی تفسیر کی ضرورت پیش آتی ہو۔ اور
بہر حال ضرورت پیش آئی تھی تو کوئی اس سے بھی زیادہ واضح جملہ بولا جاتا مگر ما انزل اللہ

کی تفسیر جس کے معنی ساری اُمت محمدیہ میں مولوی عبداللہ صاحب کے ہمخیالوں سمیت مسلّم طور پر ایک ہی ہیں۔ اور ایک ہی ہمیشہ رہے ہیں الرسول سے کی جاتی ہے جس کے معنی میں بقول مولوی صاحب ابہام ہے اُلٹے عقیدہ کے ماتحت انسان کے دماغ میں خیال بھی اُلٹے آنے لگتے ہیں۔ واضح ترین اور روشن ترین ایک ہی معنی کے لفظ کی تشریح مبہم اور دو معنی الفاظ سے کرنا انہیں اُلٹے خیالات کا نتیجہ ہے مگر جہاں ضد ہو جائے کوئی یہ بھی کہہ دے گا کہ ما انزل اللہ میں چونکہ بعض لوگ حدیث کو بھی داخل کر لیتے ہیں اس لیے اس کی تشریح الرسول یعنی "بھیجے گئے" سے کی۔ مگر جو لوگ ما انزل اللہ میں حدیث کو داخل کرتے ہیں اُن کو الرسول میں یعنی "بھیجے گئے" میں داخل کرنے سے کیا مانع ہے۔ جو اللہ نے اُتارا وہی بھیجا ہوا تو ایک ہی ہے اگر ایک میں کوئی شخص حدیث کو داخل کرے گا تو دوسرے میں بھی کر لیگا یہ تفسیر کیا ہوئی ○

مگر ہم اس تفسیری و کے کمالات کو ذرا اور غور سے دیکھتے ہیں اطیعوا اللہ ورسولہ میں تو اللہ کی تفسیر لفظ رسول سے ہوتی ہے۔ اور فاتقوا اللہ واطیعون میں ایک جملہ فاتقوا اللہ یعنی اللہ کا تقویٰ کرو کی تفسیر دوسرے جملہ اطیعون سے ہوتی ہے یعنی میری اطاعت کرو یا بقول مولوی صاحب میری موافقت کرو یعنی جس طرح میں تقویٰ کرتا ہوں اسی طرح تم تقویٰ کرو۔ یہاں بھی وہی صورت ہے اتقوا اللہ کے معنی تو ایک ہی ہیں کیونکہ جملہ کے دونوں لفظ یعنی اتقوا اور اللہ ایک ایک معنی کے ہی متحمل ہیں۔ لیکن اطاعت کے دو معنی ہیں۔ ایک حکم کا ماننا دوسرے بقول مولوی صاحب چال چلن میں موافقت اختیار کرنا۔ یہاں پھر واضح لفظ کی تفسیر مبہم سے ہوئی۔ کیونکہ ایک معنی والے لفظ کے مقابل میں دو معنی والے لفظ میں کچھ نہ کچھ ابہام ضرور ہے۔ تیسرا جملہ اس قسم کا فاتبعونی واطیعوا امری ہے یہاں بھی و تفسیری بتائی جاتی ہے گویا فاتبعونی کے معنی میں کچھ اختلاف تھا اُس کو واضح کر دیا کہ اس سے مراد ہے اطیعوا امری۔ مگر اصل یہ ہے کہ فاتبعونی کے معنی میں تو جملہ مفسرین کے ساتھ مولوی عبداللہ صاحب کو کوئی اختلاف نہیں۔ اور اطیعوا امری میں اختلاف ہے جملہ مفسرین اطیعوا امری کے معنی کرتے ہیں میرے حکم کی فرمانبرداری کرو مگر مولوی عبداللہ صاحب اس کے معنی لیتے ہیں میرے چال چلن میں میری موافقت کرو۔ پھر وہی قضیہ درپیش ہے کہ جس لفظ کے معنی میں کچھ اختلاف نہیں اُس کی تفسیر ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جس کے معنی میں اختلاف ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب بیان

کردیتے کہ اطیعوا کے وہ معنی ہی از روئے لغت غلط ہیں جو عام مفسرین کرتے آئے ہیں تو اُن کی بات بیشک قابل قبول ہوتی مگر جب وہ معنی بھی صحیح ہیں اور مولوی عبداللہ صاحب والے بھی صحیح ہیں تو بہر حال معنی میں ابہام ہوا۔ گویا تینوں مثالوں میں یعنی اطیعوا اللہ والرسول میں۔ فاتقوا اللہ واطیعون میں فاتبعونی واطیعوا امری میں تین واضح المعنی الفاظ اللہ اتقاء اللہ اور اتباع کی تفسیر تین مبہم الفاظ الرسول۔ اطیعونی۔ اور اطیعوا امری سے کی گئی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس اُلٹی بات کو قرآن مجید کی طرف منسوب کریں ہم یوں کہیں گے کہ مولوی عبداللہ صاحب کی سمجھ اُلٹی ہو گئی ہے۔ ورنہ ایسے لفظ کی تفسیر جس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ ہو ایسے لفظ سے کرنا جس کے معنی میں اختلاف اور ابہام ہے کسی عقلمند کا کام نہیں ہاں اگر عبارت یوں ہوتی اطیعوا الرسول و اللہ اطیعون و اتقوا اللہ اطیعوا امری واتبعونی تو مولوی عبداللہ صاحب کی بات بن جاتی مگر قرآن شریف کی کھلی عبارت اور اس کے صحیح معنی مولوی عبداللہ صاحب کے خیال کو اختلال کا نتیجہ بتاتے ہیں +

تفسیری واؤ

لیکن آؤ ذرا اس واؤ تفسیری پر غور کریں جس نے اتنا بڑا انقلاب دنیا میں پیدا کر دیا کہ ایک اس کی مہربانی سے تمام مجموعہ احادیث تمام اقوال و افعال نبوی نعوذ باللہ ایک ہذیانات کا مجموعہ بن گیا اور تیرہ سو سال کے سارے علوم اسلامی جو پاکیزہ سے پاکیزہ قلوب سے نکلے اور جن پر بہترین سے بہترین دماغ لگے رہے وہ تمام باطل ہو گئے۔ یہ کیسی تفسیری واؤ تھی اور تمام ائمہ و محدثین و علماء ملہمین ربانی کی آنکھوں سے کس طرح یکسر چھپی رہی۔ اور کیا ائمہ لغت اور ائمہ صرف و نحو کو بھی اس کا کوئی علم ہوا تھا یا نہیں یا وہ بھی اس سے بے خبر رہے۔ واؤ عطف کے لیے آتی ہے۔ اس عطف کے اقسام لکھتے ہوئے مغنی اللبیب میں لکھا ہے کہ ایک عطف کسی شے کا اپنے ہم معنی پر ہوتا ہے۔ والثالث عشر عطف الشئ علی مرادفہ اور اس کی مثالیں دی ہیں انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔ اولٰئک علیہم صلوٰت من ربہم و رحمۃ ط لا تری فیہا عوجا ولا امتا۔ یہاں گویا لفظ بث اور حزن۔ صلوات اور رحمۃ عوج اور امت مرادف یعنی ہم معنی لفظ ہیں تو گویا یہ جائز ہے کہ ایک لفظ پر دوسرے ہم معنی لفظ کو مزید تاکید کے لیے عطف کر دیا جائے۔ گو میرے نزدیک مرادف الفاظ کے معانی میں بھی کسی قدر اختلاف ہوتا ہے اور اسی کے اظہار کے لئے مرادف لفظ کو پہلے لفظ پر عطف لایا جاتا ہے مگر بہر حال اس بات کو تسلیم کر کے کہ ہم معنی الفاظ کا عطف ایک دوسرے

پر ہو سکتا ہے واو کو تفسیری بنا لینا خود ایک نیا علم نحو تجویز کرنا ہے جس کی اصل زبان عربی میں کوئی نہیں۔ اب اطیعوا اللہ والرسول میں الرسول کا عطف اللہ پر ہے تو کیا اللہ اور الرسول دو مرادف لفظ ہیں؟ (الرسول کے دونوں معنی ہیں سے جو چاہو لے لو) یا فاتقوا اللہ واطیعون میں آیا اتقوا اللہ اور اطیعون دو مرادف جملے ہیں۔ پس یہ تفسیری واو زبردستی کی بنائی گئی ہے۔ مرادف یعنی ہم معنی لفظ ایک دوسرے پر عطف ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ اور اس کی رسالت ہم معنی لفظ نہیں ہیں پس یہ بنیاد جس پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ خود غلط ہے۔ اور جو عمارت اس پر کھڑی ہوئی ہے اس کا حال پہلے واضح ہو چکا۔ واو تفسیری جس پر مولوی عبد اللہ اور ان کے ہمخیالوں کی ساری بحث کا دارو مدار ہے خود ان کی تجویز کردہ ہے ائمہ لغت و ائمہ نحو کو اس کا کوئی علم نہیں۔ بنائے فاسد علی الفاسد نہیں بنائے باطل علی الباطل کا مصداق اہل قرآن کے اس خاص مذہب سے بڑھ کر دنیا میں کم ہی ہوا ہو گا۔

اطاعت رسول کی آیات مدنی ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اللہ اور رسول کی اطاعت والی آیات پر مزید بحث کروں ایک خاص بات کی طرف قارئین رسالہ ہذا کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو وہ بھی بجائے خود در حقیقت ایک فیصلہ کن امر ہے۔ اللہ اور اس کے رسول محمد صلعم کی اطاعت یا صرف رسول کی اطاعت کے متعلق جس قدر آیات قرآن شریف میں ہیں جو اوپر نقل ہو چکیں وہ سب کی سب مدنی سورتوں میں ہیں۔ کیونکہ سورۂ آل عمران۔ النساء۔ المائدہ۔ الانفال۔ التوبہ۔ النور۔ الاحزاب۔ محمد۔ الفتح۔ الحجرات۔ المجادلہ۔ التغابن جن میں یہ آیات آئی ہیں سب کی سب بالاتفاق مدنی ہیں۔ دوسری طرف وہ آیتیں جن میں دیگر انبیا کی اطاعت کا ذکر ہی سوائے ایک کے سب مکی ہیں۔ کیونکہ سورۃ الشعراء۔ الزخرف سبا اور نوح مکی ہیں۔ اب اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن شریف مکہ کے تیرہ سال میں دیگر انبیاء کی اطاعت کا ذکر تو کرتا ہے کہ ان کی امتوں کو ان کی اطاعت کا حکم تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ذکر نہیں کرتا اور مدینہ میں یہ ذکر اس قدر کثرت کے ساتھ آتا ہے؟ بات یہ ہے کہ تفصیلات شریعت کل کی کل سوائے نماز کے مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ نماز تو ایک مسلمان کی زندگی کا ایسا شغل ہے جو کسی حالت میں وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اور ابتدا سے ہی نماز کا حکم پایا جاتا ہے قبل اس کے کہ وہ سورتیں یا ان کا کوئی حصہ بھی نازل ہوا ہو جن سے آج یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ یہاں اوقات نماز کا ذکر ہے اور یہاں رکعات کا ذکر ہے۔ لیکن باقی تفصیلات احکام شرعی

کی عموماً مدینہ میں ہی نازل ہوئیں۔ اس لئے مدینہ میں ہی آکر یہ ضرورت پیش آئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر زور دیا جائے گو بعض تفصیلات شریعت کا ذکر قرآن شریف میں بھی آجاتا ہے مگر بہت سی ایسی ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو وحی خفی سے واضح فرمایا پس یہیں آکر یہ ضرورت پیش آئی اور ان سورتوں کا مدنی ہونا خود اس سے ظاہر ہے کہ ان میں ایسے ذکر موجود ہیں جن کی وجہ سے انہیں لازماً مدنی تسلیم کرنا پڑتا ہے مگر تعجب اس

مولوی عبداللہ کا اپنے خیال سے ترتیب نزول قایم کرنا

بات پر ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب باوجود انکار حدیث کے بھی ایک ترتیب قرآن شریف کے نزول کی اپنے دل سے قائم کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ "پہلے نازل ہوا کہ انبیا سجدوں میں تسبیح بیان کرتے تھے (یسبحونہ ولہ یسجدون الاعراف ۲۰۶) دوسرے موقعہ پر ارشاد ہوا - کہ تم بھی سجدے میں تسبیح کیا کرو (فاسجد لہ وسبحہ الانسان ۲۶) تیسرے موقعہ پر بیان فرمایا کہ انبیا سجدوں میں تسبیح کیا کرتے تھے (سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا - بنی اسرائیل ۱۰۸) جب اس تسبیح سے لوگوں کی وحشت و نفرت کم ہوگئی۔ اور خدا کے نیک بندوں نے اس کو اپنی نمازوں میں پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ تو پھر اس مضمون کی آیات نازل ہوئیں کہ تسبیح کے ساتھ حمد بھی پڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ فرمایا... خروا سجداً و سبحوا بحمد ربھم السجدہ ۱۵) .... اور اس حکم کے نازل ہونے پر یہ سوال پیدا ہونا قدرتی تھا کہ جس طرح تسبیح کے الفاظ بتائے گئے ہیں ہم کو حمد کے الفاظ بھی بتائے جائیں اس امکانی یا واقعی سوال کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت سے نازل کیا جیسا کہ فرمایا اس نے وقل الحمد للہ الذی لم یتخذ ولدا و لم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل .... جب تسبیح کے ساتھ حمد بھی جاری ہوگئی اور حق پرست طبیعتوں نے اس کو قبول کر کے سیکھ لیا یاد کر لیا تو پھر ارشاد ہوا کہ تسبیح و حمد کے ساتھ استغفار بھی چاہیئے" اب ایک طرف مولوی عبداللہ صاحب کے حدیث کے قطعی انکار کو دیکھا جائے اور دوسری طرف اُن کی اس خاص ترتیب نزول قرآن شریف پر غور کیا جائے جس میں سب سے پہلے سورۃ الاعراف نازل ہوئی ہے۔ پھر الانسان۔ پھر بنی اسرائیل۔ پھر السجدہ پھر بنی اسرائیل تو حیرت آتی ہے آیا یہ مولوی صاحب کسی اصول کے بھی پیرو ہیں؟ یا ان کا مذہب یہ ہے کہ جو دل میں آیا لکھدیا ✦

آنحضرت صلعم کے احکام ما انزل اللہ میں داخل ہیں

بعض اعتراضات مولوی صاحب کے اس قابل نہیں

کہ اُن پر زیادہ وقت صرف کیا جائے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ حدیث پر عمل کرنا من لم یحکم بما انزل اللہ کے نیچے آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ما انزل اللہ کے ماتحت جس قدر احکام ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اسی میں شامل ہیں ان سب پر عملی حکم بما انزل اللہ ہی ہے نہ اس کا غیر۔ یا وہ کہتے ہیں یا ایہا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول مومنوں کو خطاب ہے اور مومنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں۔ مگر یہ غور نہ کیا کہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم بھی تو ہے۔ یعنی اولوا الامر کی اطاعت ضروری ہے تو کیا یہ اولوا الامر مومنوں میں شامل نہیں۔ اگر باوجود ان کے شامل ہونے کے اُن کی اطاعت ہو سکتی ہے تو رسول کے بھی الذین اٰمنوا میں داخل ہونے کے باوجود آپ کی اطاعت ہو سکتی ہے اور سچ یہ ہے کہ الذین اٰمنوا کے مقابل پر الرسول واقع ہے۔ یا وہ کہتے ہیں کہ رسول سے مراد آنحضرت صلعم اس لئے نہیں ہو سکتے کہ آپ قیامت تک موجود نہیں مگر آپ کے احکام قائم موجود ہیں۔ بیشتر حصہ ان چھوٹے چھوٹے اعتراضوں کا محض مغالطہ ہے جس کو ہر ایک ذی فہم سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے سب پر تفصیلی بحث کی حاجت نہیں۔

قرآن کریم کی ان آیات پر بحث جن میں اطاعت رسول کا ذکر ہے

اب میں چند آیات لے کر دکھاتا ہوں کہ اُن میں سوائے اطاعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کچھ مراد کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتی۔ قریباً سب ہی آیات میں دکھا یا جا سکتا ہے مگر بخوف تطویل میں اس مضمون کو مختصر کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ سورۃ نور آیت ۵۴ یوں ہے:-

قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم وان تطیعوہ تھتدوا وما علی الرسول الا البلاغ المبین۔ اس کا لفظی ترجمہ یوں ہے۔ کہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ پھر اگر تم پھر جاؤ تو اُس پر صرف وہی ہے جو اس پر ڈالا گیا اور تم پر وہ ہے جو تم پر ڈالا گیا۔ اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور نہیں ہے رسول پر مگر پہنچا دینا کھلا۔ اب یہاں وہ کھلے دلائل تو آیت کے اندر موجود ہیں جن سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہاں الرسول سے مراد پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ہو سکتے ہیں اور پیغام ہرگز مراد نہیں ہو سکتا۔ علیہ ما حمل۔ جو بشر کے سوا دوسرے کے لئے نہیں ہو سکتا۔ رسول پر تو کچھ فرض ہے اُس پر کچھ لازم کیا گیا ہے مگر قرآن شریف پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا گیا۔ نہ اُس پر کچھ

لازم کیا گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بمکلف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں نہ قرآن شریف اور جب علیہ کی ضمیر اطیعوا الرسول میں رسول کی طرف جاتی ہے۔ تو معلوم ہوا وہاں بھی وہی بشر رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ دوسری دلیل۔ وما علی الرسول الا البلاغ المبین رسول پر کچھ نہیں مگر پہنچا دینا کھلا اب بلاغ یا پہنچانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تو ہے مگر قرآن کا کام نہیں بلکہ قرآن شریف تو خود وہ چیز ہے جو پہنچائی جاتی ہے پس جو الرسول سے مراد یہاں ہے وہی پہلے فقرہ اطیعوا الرسول میں مراد ہے۔ تیسری دلیل اسی امر پر اس آیت سے پہلی آیت میں موجود ہے جہاں فرمایا واقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن امرتھم لیخرجن قل لا تقسموا طاعۃ معروفۃ ان اللہ خبیر بما تعملون النور ۵۳ اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں بڑے زور کی قسمیں کہ اگر تو اُن کو حکم دے تو وہ ضرور نکلیں گے کہو قسمیں مت کھاؤ اچھی باتوں میں فرمانبرداری کا حکم ہے بیشک اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ اب یہاں صاف لفظ ہیں امرتھم تو ان کو حکم دے اور اس پر حکم ہوتا ہے طاعۃ معروفۃ معروف میں اطاعت چاہئے تو پس یہ اطاعت فی المعروف اسی کی ہے جس کے حکم دینے کا ذکر ہے۔ اور اسی کے ساتھ ہی قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کہکر بتا دیا کہ یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ہی ذکر ہے۔ مگر قرآن شریف کو کامل مکمل مفصل مشرح کافی وافی شافی عافی" بتانے والوں کی حالت پر غور ہو اس آیت کے معنی کیا کرتے ہیں +

قل اطیعوا اللہ	کہو تو اے رسول اللہ تعالےٰ کا کہ فرمانبرداری کیا کرو اللہ تعالیٰ کی یعنی اُس کی رسالت
واطیعوا الرسول	(قرآن مجید کی) پس اگر تم (قرآن مجید سے) منہ پھیرو (تو ہرگز نجات تمہاری نہیں ہوگی)
فان تولوا فانما علیہ	اس لئے کہ تفصیل کیا گیا ہے بیچ اس رسول (قرآن مجید) کے ہر ایک حکم جو فرمایا گیا ہے
ما حمل وعلیکم	اور فرض کیا گیا ہے اوپر تمہارے عملدرآمد اس حکم کا جو فرمائے گئے ہو تم پس اگر
ما حملتم وان تطیعوہ	فرمانبرداری کرو تم اس رسول (قرآن مجید) کی ہدایت پاؤ گے تم اس لئے کہ نہیں
تھتدوا وما علی الرسول	نازل کی گئی بیچ رسول ہمارے (قرآن مجید) کے مگر کامل صفات جامع کمالات کفایت

الا البلاغ المبین مسائل (دین اسلام کے بارہ میں) جو بڑھ کر واضح و روشن ہے +

اس ترجمہ کو میں اہل انصاف پر ہی چھوڑتا ہوں کہ قرآن شریف کے مشرح و مفصل ہونے کے دعویٰ کے کہاں تک یہ مطابق ہے۔ دعویٰ تو ہے کہ قرآن شریف میں سب کچھ مشرح و مفصل موجود

ہے۔ بلکہ کافی شافی وافی طور پر اوراور باتوں کو چھوڑ کر علیہ ماحمل کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے "تفصیل کیا گیا ہو نیچ اس رسول کے" یہ صرف لفظ علیہ کا ترجمہ ہے اور ماحمل کا ترجمہ ہے "پھر ایک حکم جو فرمایا گیا" اس کی وجہ مولوی صاحب یہ دیتے ہیں کہ علی بعض وقت فی کے معنی میں ہوتا ہے بہت اچھا تو علیہ کے معنی صرف فیہ ثابت ہوئے اور "تفصیل کیا گیا" مولوی صاحب نے اپنے پاس سے داخل کیا۔ اس کی وجہ اُن کی تفصیل کی بیماری ہے کہتے ہیں بھوکے کو کسی نے پوچھا تھا دو اور دو جواب ملا چار روٹیاں۔ اور ماحمل کے معنی کی وجہ بھی سن لیجئے حمّلہ کے معنی تو لغت میں ہیں کلفہ یعنی اسے کسی چیز کا) مکلف کیا مگر مولوی عبداللہ صاحب لکھتے ہیں کہ منتہی الارب میں معنی لکھے ہیں فرمود اورا یعنی اس کو فرمایا۔

مولوی عبداللہ کا ماحُمّل کا ترجمہ	چنانچہ مولوی صاحب "مناظرہ" کے صفحہ ۳۴ پر لکھتے ہیں "اس جگہ صرف حوالہ پر ہی اکتفا کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا بلکہ عبارات کتب لغت کی لکھنی

ضروری ہیں اب وہ عبارات بعینہ لکھی جاتی ہیں۔ حملہ الامر تحمیلاً وحمالاً ککذاب فرمود اورا الخ منتہی الارب جلد اول"۔ چنانچہ اسی بنا پر مولوی صاحب نے حمل کا ترجمہ کیا ہے "جو فرمایا گیا"۔ اگر یہ عبارت نقل کردہ صحیح بھی ہوتی تو بھی ماحُمّل کا ترجمہ کرنا چاہئے تھا "جو کچھ اُسے فرمایا گیا" نہ صرف "جو کچھ فرمایا گیا" کیونکہ حُمّل میں ضمیر مجہول موجود ہے اس کو بلا ترجمہ چھوڑنا دھوکا دینا ہے اور جگہ مولوی صاحب زائد فقرے بڑھانے کو تیار رہیں اور یہاں مطلب کے مخالف دیکھ کر ضمیر کو بلا ترجمہ چھوڑ دیا تو اب مولوی صاحب کی لغت کے مطابق علیہ ماحمل کا ترجمہ ہوا بیچ اس قرآن کے ہے جو کچھ فرمایا گیا اُس قرآن کو۔ کیا خوب ترجمہ ہے۔ اول تو قرآن کو فرمایا گیا بھی ایک بےنظیر محاورہ ہے۔ پھر یہ تو نہایت ہی فصاحت و بلاغت کا کلام ہی کہ بیچ اس قرآن کے ہے جو کچھ فرمایا گیا اس قرآن کو۔ دندان تو جملہ در دہانند۔ کے تو پھر کچھ معنی ہیں مگر قرآن شریف کو بدنام کرنے میں مولوی عبداللہ صاحب نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ اللہ اُن پر رحم کرے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر مولوی صاحب عمداً لغت میں تحریف کرنے کے الزام کے نیچے ہیں۔ کیونکہ منتہی الارب سے جو عبارت انہوں نے نقل کی ہے وہ ناتمام نقل کر کے حُمّل کے معنی "فرمایا" کئے ہیں۔ منتہی الارب کی عبارت یوں ہے "فرمود اورا بہ برداشتن و کردن کار" یعنی اس کو حکم دیا ایک کام کے کرنے اور اس کا بوجھ اُٹھانے کا جو بعینہ مکلف کرنے کے معنی ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے نصف عبارت نقل کر کے اور

نصف چھوڑ کر یہ دھوکا دینا چاہا ہے کہ اس کے معنی صرف فرمانا ہیں۔ حالانکہ اس کے معنی ہیں ایک کام کے کرنے اور اُس کا بوجھ اُٹھانے کا حکم دینا۔ اب چونکہ کام کا کرنا اور بوجھ اُٹھانا تو رسول بشری کے سوائے درست نہ ہو سکتا تھا اس لئے مولوی صاحب نے تحریف کی اور اپنی طرف سے عبارت نقل کر دی مگر ادھوری نقل کر کے اپنا کام نکالنے کی کوشش کی اور پھر اس قدر معنی کرنے میں دوسرا دھوکا یہ دیا کہ ماحمل کا ترجمہ نہ کیا۔ "جو اسے فرمایا گیا" جو صحیح ترجمہ ہے بلکہ صرف اس قدر کر دیا جو کچھ فرمایا گیا۔ ان دھوکا بازیوں کے ساتھ حدیث کو افترا اور بہتان اور ہذلیات کہا جاتا ہے اللّٰہم ارحم عبادک

اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت والی آیت

دوسری آیت جس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ تمام امور دینی و دنیوی میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا اصول تھا۔ مگر افسوس کہ خواہ مخواہ اُس کے الفاظ میں تحریف کر کے اُس کے مفہوم کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آیت سورۃ النساء کی ہے +

یا یہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول	اے لوگو جو ایمان لائے ہو فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور اپنے میں سے صاحب اختیار لوگوں کی پھر اگر کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

ان مختصر الفاظ میں اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان اللہ اور رسول کے احکام کی فرمانبرداری کریں یعنی قرآن و حدیث کی اور صاحب اختیار لوگوں کی بھی فرمانبرداری کریں خواہ وہ دنیاوی معاملات میں صاحب اختیار ہوں جیسے حکام اور خواہ دینی معاملات میں جیسے مجتہد پھر اگر اولی الامر کے ساتھ جھگڑا ہو۔ تو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ یعنی آخری فیصلہ ہر حال میں قرآن و حدیث کا ہوگا یہاں تمام حکام اور مجتہدین کو قرآن و حدیث کا پابند کر دیا۔ بڑے سے بڑا بادشاہ اور بڑے سے بڑا عالم قرآن و حدیث کے اسی طرح ماتحت ہے جس طرح ایک ادنیٰ آدمی۔ ائمہ مجتہدین کا لفظ اولی الامر میں شامل ہونا خود قرآن شریف سے ثابت ہے جہاں فرمایا۔ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منہم لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم اور اگر وہ اس بات کو رسول کی طرف لوٹاتے اور صاحب اختیار لوگوں کی طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اس کو جان لیتے جو اُن میں سے استنباط (یعنی علم کا استخراج) کرتے ہیں۔ استنباط کے معنی لغت میں الاستخراج ہی لکھے ہیں۔ اور قرآن مجید میں اس موقعہ پہ گو خبر کا ذکر ہے۔

مگر یہاں بھی خبر کا استخراج ہی مراد ہے یعنی واقعات بیان کردہ سے صحیح بات کو نکال لینا جس طرح فقیہہ مسئلہ کو نکال لیتا ہے۔ اور یہ قوت استنباط ایک علمی قوت ہے۔ اب مولوی عبداللہ صاحب کے معنی ملاحظہ ہوں +

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول	اے ایمان والو (دین اسلام کے بارے میں) حکم مانو اللہ تعالیٰ ہی کا یعنی حکم مانو صرف کتاب اللہ کا اور (سلطنت کے بارہ میں) حکم مانو حکام وقت کا جو تم پر حکمراں ہوں۔ پس اگر جھگڑ پڑو تم آپس میں دین اسلام کے کسی امر میں تو اس کو رجوع کرو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کی طرف یعنی خالص کتاب اللہ ہی کے حکم کی طرف +

اس ترجمہ کو دیکھئے تو "کامل مکمل مفصل و مشرح کافی شافی وافی عافی" کتاب کیا کرتی ہے کہ جو اصل باتیں تفصیل کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ اُنہی کو چھوڑ دیتی ہے۔ چنانچہ یہ تفصیل و تشریح مولوی عبداللہ صاحب کو کرنی پڑتی ہے۔ اب یہاں چند لفظوں کے ایک جملہ میں پہلے تو یہ بتانا تھا کہ اللہ کی اطاعت صرف دین اسلام کے بارے میں ہے وہ نہیں بتایا مولوی عبداللہ صاحب کو قیاس کر کے یہ بڑھانا پڑا۔ پھر حکام وقت کی اطاعت کا حکم دیتے وقت یہ بتانا تھا کہ سلطنت کے بارہ میں اُن کا حکم مانو اُس کو بھی چھوڑ دیا۔ پھر فان تنازعتم فی شیء میں یہ بتانا تھا کہ دین اسلام کے کسی امر میں جھگڑا کرو اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور یہ ساری کمی مولوی عبداللہ صاحب کو پوری کرنی پڑی ۔ اور جس امر کی تشریح کی کوئی ضرورت نہ تھی اُس کی تشریح شروع کر دی۔ یعنی یہ کہ اللہ کی اطاعت سے مراد اُس کے پیغام یعنی احکام کی اطاعت ہے جسے سب دنیا جانتی تھی اور کسی کے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ اس کے کچھ اور معنی ہو سکتے ہیں۔ پھر فردوہ الی اللہ والرسول میں اللہ کی طرف لوٹانے کی تفسیر شروع کر دی کہ اس سے مراد اُس کے پیغام یعنی قرآن کی طرف لوٹانا ہے۔ کیا یہ حکمت کتاب ہے کہ جہاں تشریح کی ضرورت تھی وہاں کی نہیں اور جہاں ضرورت نہ تھی وہاں تشریح شروع کر دی؟ اب ہم تو حیران ہیں کہ قرآن شریف تو مفصل و مشرح نہ رہا۔ ہاں مولوی عبداللہ صاحب کا ترجمہ مفصل و مشرح ہو گیا۔ لیکن اس ترجمہ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے رو سے فان تنازعتم میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں جس طرح دو مسلمانوں میں دین اسلام کے کسی مسئلہ میں اختلاف ہو سکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان

میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ پس یہ کیسا اچھا نظارہ ہوگا کہ ایک طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو آپ پر ایمان لاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بات فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ قرآن مجید میں یوں ہے اور آپ پر ایمان لانے والے لکھتے ہیں نہیں آپ غلطی کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ یوں نہیں مثلاً دیکھئے مولوی عبداللہ صاحب نے قرآن شریف سے دو تین چار رکعت نماز نکالی۔ اُن کے بعض پیرو کہتے ہیں نہیں دو رکعت کی نماز ہی ثابت ہے۔ اب یہ اُستاد اور شاگردوں میں جھگڑا ہے۔ شاگرد کہتے ہیں اُستاد نے قرآن کریم کے معنی غلط کئے ہیں حدیث کی عینک لگا کر قرآن شریف کو پڑھا ہے اور آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مجتہد ایک مسئلہ بتاتا ہے اور اس کا شاگرد اُس کے خلاف اجتہاد کرتا ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے آپ کے شاگردوں امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کو بعض باتوں میں اختلاف ہے۔ اور کسی نہ کسی مسئلہ میں ہر ایک کو دوسرے سے اختلاف ہو جاتا ہے حتیٰ کہ صحابہؓ میں بھی اختلاف مسائل پایا جاتا ہے۔ تو اگر رسول صلعم محض ایک مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر آپ سے بھی صحابہ کو اختلاف ہونا چاہئے۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فرماتے ہیں۔ صحابہؓ کہتے ہیں آپ نے اس مسئلہ کو نہیں سمجھا اور جس طرح ایک معمولی مجتہد غلطی کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہ ماننا پڑا کہ آپ بھی غلطی کر سکتے تھے۔ اس قسم کے اعتقادات نے مولوی صاحب کو یہاں تک پہنچایا کہ ایک جگہ آپ لکھتے ہیں "رسول اللہ کی زبان مبارک سے دین کے متعلق یا قرآن مجید کا نکلنا تھا۔ اور یا سہواً اپنے خیالات و قیاسات جن میں القائے شیطانی موجود ہوتا تھا" میں کہتا ہوں کہ یہ سراسر شیطانی خیال ہے کہ آنحضرت صلعم کی ذات والا کی طرف شیطانی القا منسوب کیا جائے یہ پرلے درجے کی بے ایمانی ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف سے غلط مسئلے بھی بیان کر دیا کرتے تھے۔ اگر یہی حالت تھی تو پھر تعلیم کتاب و حکمت خوب تھی +

وحی خفی کا ذکر قرآن شریف میں

مولوی عبداللہ صاحب کو یہ چڑ ہے کہ وحی خفی کا نام لیا جائے۔ حالانکہ اس وحی کا ذکر خود قرآن شریف کرتا ہے۔ کیونکہ جب یہ فرمایا کان علینا بیانہ تو جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل کے بارہ میں فرمایا۔ اُس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف ہی منسوب کیا جس طرح جمع قرآن کو اپنی طرف منسوب کیا۔ حالانکہ کوئی وحی آپ پر ایسی

تو نازل نہ ہوئی تھی کہ فلاں سورت کو فلاں جگہ رکھو اور فلاں آیت کو فلاں جگہ رکھو۔ پس آپکا ترتیب سور و آیات دینا بھی خدا کی طرف سے تھا۔ اور بیان مسائل بھی خدا کی طرف سے تھا لیکن چونکہ یہ وحی متلو کے ذریعہ سے نہیں ہوا اس لئے اسے وحی خفی کہا جاتا ہے میں جانتا ہوں کہ مولوی صاحب کے بعض پیرو یہاں تک بھی پہنچے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی جمع کو بھی نہیں مانتے لیکن کم از کم شاید اس قدر تاریخ کے موٹے امور سے انہیں انکار نہ ہوگا کہ کچھ حصہ قرآن شریف کا مکہ معظمہ میں نازل ہوا اور کچھ مدینہ منورہ میں۔ اب اگر ترتیب نزول کوئی اور نہ تھی تو معلوم ہوا کہ سورہ بقرہ آل عمران انفال توبہ وغیرہ جن میں جنگ بدر۔ جنگ احد۔ غزوہ تبوک وغیرہ کا ذکر ہے مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور پچھلی سورتیں جن میں کسی جنگ کا ذکر نہیں وہ مدینہ میں نازل ہوئی تھیں۔ اگر انکار واقعات میں یہ لوگ ابھی اس حد تک نہیں پہنچے تو صاف ظاہر ہے کہ ترتیب نزول اور تھی اور ترتیب موجودہ اور ہے لیکن نزول کے سوا کوئی دوسری ترتیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اپنے خیال سے دی تو اس میں بقول مولوی عبداللہ صاحب نعوذ باللہ القائے شیطانی کا دخل تھا اور اگر وحی سے دی تو وہ وحی قرآن شریف میں کہیں موجود نہیں کہ فلاں سورت کو فلاں جگہ رکھو اور فلاں آیت کو فلاں جگہ۔ اور نبی کریم صلعم کے اپنے خیال کو اللہ تعالےٰ علینا جمعہ کیوں کہتا یعنی جمع کرنا ہمارے اوپر ہے علینا جمعہ کیوں نہ فرمایا یعنی جمع کرنا تیرا کام ہے اپنی طرف منسوب کرکے بتا دیا کہ جمع قرآن بھی وحی الٰہی سے ہے۔ اور ایسی وحی کے قرآن شریف میں موجود نہ ہونے نے بتا دیا کہ وہ وحی کسی اور رنگ کی ہے اور جمع اور بیان والی وحی ایک ہی ہے اسی کو وحی خفی کہا جاتا ہے۔ اور یہ خیال کہ وحی صرف ایک ہی قسم ہو سکتی ہے سراسر نافہمی ہے قرآن شریف میں تو زمین کی وحی کا بھی ذکر ہے بان ربک اوحی لھا۔ اور شہد کی مکھی کو وحی کا بھی ذکر ہے۔ واوحی ربک الی النحل۔ اور غیر انبیاء کو وحی کا بھی ذکر ہے اوحیت الی الحواریین۔ اوحینا الی ام موسےٰ اور ملائکہ کو وحی کا بھی ذکر ہے۔ حالانکہ وہ خود وحی کو لانے والے ہیں۔ اذ یوحی ربک الی الملائکۃ پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کئی طرح پر ہے۔

قرآن شریف میں نماز اور وضو کے ذکر سے وحی خفی پر کھلا استدلال

قرآن شریف میں نماز کا حکم کب نازل ہوا؟ ظاہر ہے کہ نہایت ابتدائی سورتوں میں یہ حکم پایا جاتا ہے۔ سورۂ اقرا میں سورۂ مزمل میں۔ اور دوسری ابتدائی سورتوں میں اور تاریخ سے بھی یہی شہادت ملتی ہے پس اگر نماز کی

تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت تھی اور نبی کریم صلعم وحی خفی کے ذریعہ سے ان تفصیلات کے بتانے کے مجاز تھے۔ تو چاہیئے تھا کہ اُن تمام تفصیلات کے جو نماز کے متعلق قرآن شریف میں بتائی جاتی ہیں نازل ہونے کے بعد نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا اور ایسا ہی وضو کی تفصیل بھی پہلے نازل ہو لیتی۔ لیکن جو شخص مولوی عبداللہ صاحب کی تشریحات کو پڑھے گا وہ صاف دیکھ سکتا ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب نے ان آیات سے نماز کی تفصیلات کا استدلال کیا ہے جو نماز کے حکم کے مدتوں بعد نازل ہوئیں اور ایسا ہی آج مولوی صاحب کے مرید کرتے ہیں یہ عجیب تفصیل ہے کہ حکم تو نماز پڑھنے کا پہلے دیدیا اور تفصیلات سالہا سال بعد بیان کیں کیا کوئی عقلمند اس کو قبول کر سکتا ہے یا خدا کی طرف ایسی بات منسوب کر سکتا ہے۔ ہاں یوں کہنا چاہیئے کہ جب قرآن کریم نے بعد میں نازل ہو کر نماز کے اوقات وغیرہ کا بھی بعض حالات میں ذکر کر دیا تو گویا جو کچھ نبی کریم صلعم نے وحی خفی سے اوقات یا ارکان مقرر فرمائے تھے۔ اُن کی صحت کو تسلیم کر لیا۔ ایسا ہی آج کل کے مولوی صاحب کے شاگرد جو نماز کی تفصیل کو واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ سے نکالتے ہیں۔ وہ غور کریں کہ یہ آیت جیسا کہ اُس کے الفاظ بتلاتے ہیں حالت جنگ کی ہے اور جنگ مدینہ میں آکر شروع ہوئی۔ اور وہ بھی ایک مدت کے بعد۔ حالانکہ نماز کا حکم ابتدا میں ہی نازل ہوا۔ تو اب یہ عجیب تماشہ ہے کہ نماز کا حکم دینے کے اٹھارہ سال بعد یہ بتایا کہ حالت جنگ میں تمہاری نمازیوں ہوگی اور اس سے تم حالت امن کی نماز کا قیاس کر لو۔ کیا ایسی لغویات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتی ہیں حق یہ ہے اور یوں کہنا چاہیئے۔ کہ جو نماز پہلے پڑھی جاتی تھی اسی کو بنیاد قرار دے کر نماز جنگ کا ذکر کیا جس سے معلوم ہوا کہ وحی متلو نے اُسی نماز کو صحیح قرار دیا جو وحی خفی کے ذریعہ سے اٹھارہ سال پیشتر حضرت نبی کریم صلعم بتا چکے تھے۔ ایسا ہی وضو کی تفصیل کہ نماز سے پیشتر منہ اور کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھوؤ اور سر کا مسح کرو سورہ مائدہ میں ہے جو بہت پچھلے زمانہ میں مدینہ میں آکر نازل ہوئی حالانکہ وضو تو شروع سے کیا جاتا تھا۔ اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ جو صورت وضو کی نبی کریم صلعم نے بتائی تھی وہی درست ہے اور وحی متلو کا اُس کو اپنے اندر لے لینا بتاتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے وضو اپنی رائے سے مقرر نہ کیا تھا بلکہ وحی خفی سے وضو کو ضروری ٹھہرایا اور وحی خفی سے ہی اُس کی تفصیلات بتائیں۔ یہ وحی خفی پر قرآن کریم سے ایسا کھلا استدلال ہے جس کو مسلمان کہلا کر کوئی شخص رد نہیں کر سکتا

وحی تین رنگ

خود بشر کے ساتھ وحی کے تین رنگوں کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء (الشوریٰ - ۱۰) اور نہیں شایان کسی بشر کو کہ اللہ تعالیٰ اُس کے ساتھ کلام کرے مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے پس اپنے اذن سے جو چاہے وحی کرے۔ یہاں خاص بشر کے ساتھ کلام کرنے کا ذکر ہے اس لئے وہ لوگ اس میں شامل نہیں ہو سکتے جن کی طرف رسول بھیجے جاتے ہیں مگر خود اُن کے ساتھ کلام نہیں ہوتا جیسا کہ اُن کا اپنا قول قرآن شریف میں منقول ہے لولا یکلمنا اللہ۔ اللہ ہمارے ساتھ کیوں کلام نہیں کرتا۔ مولوی عبداللہ صاحب نے یہاں پر غلطی کھائی ہے اور جن لوگوں کی طرف رسول بھیجے گئے اُن کے ساتھ بھی خدا کا کلام کرنا مانا ہے حالانکہ قرآن شریف اُس کا انکار کرتا ہے۔ پس یہاں خاص بشر کے ساتھ کلام کا ذکر ہے اور اس کی تین طرزیں بتائیں۔ سب سے اول خود لفظ وحی کو رکھا ہے جس کے اصل معنی ہیں اشارہ سریعہ یعنی تیز اشارہ اور یہ کسی بات کے دل میں ڈالنے کا نام ہے جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے القاء فی الروع۔ پس یہ بھی ایک طرز کلام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کے دل میں ایک بات ڈال دے اُس کے مقابل پر شیطانوں کے اپنے ساتھیوں کو وحی کرنے کا ذکر ہے ان الشیاطین یوحون الیٰ اولیائھم۔ شیطان اپنے ساتھیوں کی طرف وحی کرتے ہیں۔ حالانکہ شیطان بھی الفاظ کی وحی نہیں کرتے بلکہ دل میں ایک بات ڈالتے ہیں الذی یوسوس فی صدور الناس سو دل میں ڈالنا ہی وحی خفی ہے۔ کیونکہ بمقابلہ الفاظ والی وحی کے اس کا رنگ خفی ہے۔ دوسرا طریق کلام کا اللہ تعالیٰ نے من وراء حجاب فرمایا ہے جیسا کہ رویا میں ہوتا ہے کیونکہ رویا میں ایک پردہ ہوتا ہے اور وہ تعبیر طلب ہوتی ہے۔ ایسا ہی وہ کلام یا آواز جو انسان سنتا ہے یا وہ الفاظ جو اُس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں جس پر تمام اولیائے اُمت کی متفقہ شہادت ہے اور خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رؤیا کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق اللہ نے اپنے رسول کو رؤیا سچ دکھایا تھا اور گو اصل رؤیا کو قرآن شریف میں بیان نہیں کیا مگر اُس کی تعبیر کو بیان کیا ہے لتدخلن المسجد الحرام تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے یعنی وہ خواب اس طرح پورا ہو کر رہے گا۔ پس رؤیا اور الہام بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کی ایک

قسم ہے جس کو من وراء حجاب کہا ہے تیسری قسم وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہو جس میں اللہ تعالیٰ ملک رسول یعنی جبرائیل کو بھیجتا ہے نزلہٗ روح القدس علیٰ قلبك اور دوسری جگہ ہے قل من کان عدوا لجبریل فانه نزله علیٰ قلبك باذن الله کہو جو شخص جبریل کا دشمن ہو تو اسی (جبریل) نے اسے (یعنی قرآن کو) تیرے دل پر اتارا اللہ کے اذن سے۔ یہاں انه کی ضمیر جبریل کی طرف ہی جاتی ہے جو قریب تر ہے اور باذن الله میں اللہ کا لفظ صراحتاً لانا بھی یہی ثابت کرتا ہے۔ ورنہ صورت عبارت یوں ہونی چاہیے تھی فان الله نزله علیٰ قلبك باذنه پس قسم اول جس کو صرف وحی کہا ہے وہ درحقیقت وحی خفی ہے جس میں صرف دل میں ایک بات ڈالی جاتی ہے +

وحی خفی پر دو اعتراض اول آنحضرت سے وقوع سہو یا غلطی

یہاں پر دو سوال کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ اگر وحی خفی کوئی چیز ہے تو باوجود وحی خفی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی موقعہ پر سہو یا نسیان یا غلطی کیوں ہوئی۔ اور دوسرے یہ کہ پھر اس وحی خفی کو کامل طور پر محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام اللہ تعالیٰ نے کیوں نہ کیا جیسا کہ قرآن کریم کی حفاظت کا انتظام کیا ان دونوں سوالوں کا جواب یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وحی متلو اور وحی خفی کے مرتبہ میں فرق دکھانے کے لئے ایسا کیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سہو وغیرہ بھی اُمت کی تعلیم کے لئے تھا لیکن کسی مسئلہ کے بیان کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی غلطی نہیں لگی کیونکہ اس سے امن اُٹھ جاتا تھا البتہ بعض دوسری باتوں میں غلطی لگی کیونکہ آخر آپ بشر تھے۔ اور بتقاضائے بشریت کسی وقت غلطی لگ جانا یا سہو ہو جانا نبوت کا منافی نہیں۔ ہاں اگر آپ مسائل غلط بیان کرنا شروع کر دیں جیسا کہ مولوی عبداللہ صاحب کا خیال ہے تو پھر تو شریعت سے امن اُٹھ جاتا ہے اور جن مواقع پر آپ کو غلطی لگی یا سہو ہوا اُس میں بھی درحقیقت اُمت کی تعلیم ہے اور بڑے بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک رؤیا کی تعبیر میں غلطی لگی جیسا کہ ابھی حدیبیہ والا رؤیا بیان ہوا حالانکہ رؤیا سچ تھا مگر رؤیا میں یہ نہ تھا کہ اس سال آپ حج کریں گے واپس ہونا پڑا مگر اس سے تو اس قدر نیک نتائج پیدا ہوئے کہ جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ مجملاً دیکھئے یہ صلح فتح مبین ثابت ہوئی اس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہوئے چنانچہ صلح حدیبیہ کے وقت آپ کے ساتھ تیرہ سو یا پندرہ سو آدمی ہیں۔ ڈیڑھ سال بعد فتح مکہ کے وقت دس ہزار ہیں پھر صلح کر کے یہ بتا دیا کہ یہ اسلام کا حکم نہیں کہ جنگ

سب مسلمان نہ ہوں جنگ کرتے جاؤ اگر ایسا حکم ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے ساتھ
کبھی صلح نہ کرتے پھر شرائط صلح میں شرط لکھی گئی کہ مسلمانوں میں سے کوئی کفار کے ساتھ جا ملے تو وہ
اُسے واپس نہیں کریں گے اور کوئی کافر مسلمان ہو کر آنحضرت کے پاس آئے تو آپ اُسے واپس
کر دیں گے اب مسلمانوں میں سے ایک کا بھی کفار کے ساتھ جا ملنا ثابت نہیں جس سے معلوم
ہوا کہ بزور شمشیر مسلمان نہ ہوئے تھے ورنہ سب کے سب فوراً کفار کے ساتھ جا ملتے اور کفار قریش
میں سے جو لوگ مدینہ میں آنحضرت صلعم کے پاس آئے آپ نے انہیں واپس کیا اور یوں
پابندی معاہدہ کر کے سبق دیا پھر جو لوگ واپس ہوئے وہ اس قدر اخلاص اسلام کے ساتھ
رکھتے تھے کہ مکہ واپس نہیں گئے بلکہ الگ جا کر اپنی ایک آبادی بنالی جہاں آہستہ آہستہ ایک
خاصی جماعت بن گئی اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی کشش کس قدر غالب تھی کہ حالانکہ مسلمان
بھی اپنے ساتھ نہیں ملاتے پھر بھی کفار میں واپس نہیں گئے اس نے دو باتوں پر مہر لگادی
اول اُن کے دلوں میں دنیوی لالچ ذرہ بھر نہ تھا دوم اُن کا اخلاص ایک پہاڑ کی طرح تھا جس
کو کوئی دُکھ اور فتنہ جنبش نہیں دے سکتا تھا پس یہ غلطی بھی اُمت کے لئے بہت سے
فوائد کا موجب ہوئی۔ یا مثلاً آپ نے ایک موقعہ پر اپنی کسی بی بی کی خوشی کے لئے کسی چیز کو ترک
کر دیا تو یہ کوئی مسئلہ نہیں جو غلط بیان کر دیا ہو بلکہ آپ نے اپنی ذات کے لئے ایک چیز کو جس سے
آپ کو محبت بھی تھی ترک کر دیا اور یہ حسن معاشرت میں ایک سبق تھا یا اس یہ درست نہ تھا
اللہ تعالیٰ نے اس غلطی پر متنبہ کر دیا۔ یہ غلطی کرا کر متنبہ کرنا اس لئے تھا کہ تا اُمت کو یہ بات
ذہن نشین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو ارادۃً ترک کر دینا درست نہیں
یا مثلاً ایک نابینا کے اُس وقت آنے پر جب آپ بعض کفار کو سمجھا رہے تھے اور اُس کے
آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر آپ کا پیشانی پر بل آجانا حالانکہ محض ایک تقاضائے
بشریت ہوا اور نابینا پیشانی کے بل کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر چونکہ آپ کو اعلیٰ اخلاق کو
قائم کرنا اور آپ کی اُمت کو ایک سبق دینا تھا اس لئے فرمایا عبس وتولّٰی ان جاءہ الاعمیٰ کو
یہ نہایت ہلکی فروگزاشت تھی مگر یہ بھی اس لئے ہوئی کہ تا مخالفوں پر اتمام حجت ہو کہ یہ وحی
رسول کے دل سے پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اگر خود بنانے والا ہوتا تو اپنی کمزوری کی تشہیر کیوں
دنیا میں کرتا۔ غرض وہ تمام اُمور جن میں آپ سے فروگزاشت یا سہو ہوا وہ مسائل دینی کے
بیان کرنے میں تو ہرگز نہیں ہوا اور وحی خفی کی روشنی مسائل کے بیان کرنے سے ہی مخصوص ہے

جیسا کہ ثم ان علینا بیانہ سے ثابت ہے۔ البتہ ان فروگذاشتوں اور سہو سے بڑی عظیم الشان باتیں اخذ ہوتی ہیں۔ باقی رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بی بی کو جس کے خاوند نے اُس سے ظہار کیا تھا غلط مسئلہ بتا دیا تھا یہ بالکل غلط ہے۔ حدیثوں سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس بارہ میں مجھ پر وحی نہیں اُتری اور قرآن شریف سے بھی ہرگز غلط مسئلہ بتانا ثابت نہیں ہاں آپ نے اصلاح اُسی وقت فرمائی جب آپ پر وحی نازل ہوئی اور غزوہ تبوک میں آپ کا بعض لوگوں کا عذر قبول کر لینا اور اُن کو چھوڑ دینا۔ اُس کو بھی کسی مسئلہ سے کیا تعلق ہے۔ بلکہ یہ تو امور سلطنت میں سے ایک امر ہے۔ اور بقول مولوی عبداللہ صاحب اس میں تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ امور سلطنت میں حکام کی اطاعت کا ذکر ہے اور حاکم آپ تھے۔ آپ نے جو فیصلہ کیا مناسب کیا۔ پس اس پر اللہ تعالے کا عفا اللہ عنک لم اذنت لھم فرمانا تو مولوی عبداللہ صاحب کی غلطی ہی ثابت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ امور سلطنت بھی امور دینی میں ہی داخل ہیں۔ الگ نہیں مگر یہاں بھی کوئی مسئلہ آپ نے کسی وقت کسی کو غلط نہیں بتایا۔ غرض نہ قرآن شریف کی کسی آیت سے اور نہ کسی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے کسی وقت کسی کو غلط مسئلہ بتا دیا ہو۔ البتہ جو مسئلہ آپ پر ابھی نازل نہ ہوا تھا اُس کو آپ نزول سے پہلے یوں ہی خود بنا کر نہ کہہ دیا کرتے تھے۔ پس وحی خفی سے مسائل کا بتانا ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی مسلمان کہلا کر انکار نہیں کر سکتا۔

دوئم وحی خفی کی حفاظت قرآن شریف کی طرح کیوں نہ ہوئی۔

رہا یہ سوال کہ حدیث اس طرح پر محفوظ کیوں نہ رہی جس طرح قرآن شریف میں پوچھتا ہوں کہ توریت و انجیل اور اور کتب منزلہ اس طرح پر کیوں محفوظ نہ رہیں جس طرح پر قرآن شریف محفوظ رہا۔ حالانکہ وہ تو وحی متلو تھی مثلاً انجیل حضرت عیسیٰ سے تھوڑی دیر بعد ہی محرف نظر آتی ہے حالانکہ اس پر عملدرآمد تو آنحضرت صلعم کے زمانہ تک ضروری تھا۔ اور اب بھی وہ محرف نہ ہوئی تو عیسائیوں پر اتمام حجت کیسا آسان ہوتا لیکن میں اگلے مضمون میں دکھاؤں گا کہ حدیث کی حفاظت کے سامان اللہ تعالےٰ نے کس قدر رکھے اور وحی خفی ہونے کے باوجود وہ تورات و انجیل سے جو وحی متلو ہیں بہت زیادہ محفوظ ہے۔

چوتھا باب
جمع حدیث

جمع حدیث پر اعتراض

ضرورت حدیث کے مضمون کو بیان کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ ہماری راہ میں یہ ہے کہ آیا اُس وقت سے پہلے جب محدثین نے احادیث کو کتابوں میں مدوّن کیا کوئی سامان حفاظت حدیث کا تھا یا نہیں؟ کیونکہ خواہ محدثین نے کتنا بھی نیک نیتی سے کام لیا ہو۔ جس کا اعتراف بیرونی اور اندرونی معترضین کو یکساں ہے۔ تاہم اُن کی نیک نیتی اور اُن کی محنت کسی بڑے مفید نتیجے تک نہیں پہنچا سکتی اگر ابتدائی ایک ڈیڑھ سو سال میں حدیث کی حفاظت نہ کی گئی ہو۔ بیرونی معترضین کا تو یہ خیال ہے کہ حدیث کی ضرورت ابتدائی زمانہ اسلام میں نہ تھی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مثلاً خلیفہ اول اور اوائل زمانۂ خلیفہ ثانی میں۔ کیونکہ اُس وقت مسلمانوں کی ضروریات کا دائرہ نہایت محدود تھا اور کہ فتوحات اسلامی کے ساتھ اور سلطنت کی وسعت کے ساتھ یہ ضرورت پیش آئی اور حدیثیں بنانی شروع کی گئیں۔ اور اندرونی معترضین کہتے ہیں۔ کہ زمانہ نبوی اور زمانہ صحابہ اور تابعین وغیرہ میں حدیث کا کوئی وجود ہی نہ تھا بلکہ سیکڑوں برس بعد یہ آنحضرت صلعم پر افتراؤں کا (نعوذ باللہ منہ) انبار تیار کیا گیا۔ اور راویوں وغیرہ کے نام یوں ہی گھڑ لئے گئے اندرونی معترضین نے یہاں ایک ایسا پُر دعویٰ کیا ہے جس کو معمولی سے معمولی سمجھ کا انسان بھی قبول نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ مخالفین کو بھی اس بات کے پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوئی مگر ہمارے اہل قرآن دوستوں نے چونکہ آنکھیں بند کر کے اپنا عقیدہ بنایا ہے اس لئے اُن کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ کوئی بات دماغ انسانی میں سما سکتی ہے یا نہیں اور وہ حملہ قرآن شریف پر کر دیا جو کوئی مخالف بھی نہیں کر سکا۔ بہر حال اس پر میں کچھ تمہید میں لکھ چکا ہوں۔ اور اب میں اس باب کے اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

زمانہ نبوی میں ضرورت حدیث

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا حدیث کی ضرورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی یا نہیں؟ جو شخص کچھ بھی تاریخ اسلامی پر غور کرنے کی تکلیف

گوارا کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ شریعت اسلامی کی بنیاد ابتدا سے ہی اولاً قرآن کریم پر اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل پر رکھی گئی مثلاً قرآن کریم ابتدا میں ہی مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ تم نماز پڑھو لیکن نماز کس طرح پڑھنی چاہیئے۔ اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن شریف نے نہیں بتائی۔ اور اگر بعد میں کبھی نماز کے بعض ارکان کا ذکر کر بھی دیا ہو تو کم از کم ابتدا میں نماز کے حکم کے ساتھ ہی کوئی تفصیل نہیں بتائی کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہیئے پس نماز کے متعلق کل کے کل احکام اور اس کے پڑھنے کا طریق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور یہی آپ کا سکھانا یعنی عمل سے بتانا کہ نماز یوں پڑھنی چاہیئے۔ یا اپنے اقوال سے تشریح کرنا اور ذکر بتانا حدیث ہے۔ ایسا ہی دوسرے احکام قرآنی کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے پس حدیث کی ضرورت قرآن کریم کے نزول کے ساتھ ہی پیدا ہوئی۔ آنحضرت صلعم صرف ایک اخلاقی واعظ نہ تھے۔ کہ کچھ مواعیظ آپ پر نازل ہوئے تو آپ نے لوگوں کو وہ سنا چھوڑے بلکہ آپ ابتدا سے ہی ایک شارع تھے اور اپنی قوم کو ایک خاص راہ پر چلانے اور ان کے تعلقات باللہ اور تعلقات انسانی میں ان کو تعلیم دینا یہ شروع سے ہی آپ کا کام تھا۔ آپ کا ہر ایک قولی اور فعلی صحابہ کے لئے ان کی زندگیوں کا سب سے قیمتی ذخیرہ تھا۔ اور جس قدر ضرورت صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ کے اقوال و افعال کی محسوس ہوتی تھی۔ اگر اس قدر ضرورت اس زمانہ میں بھی محسوس ہوتی تو ہم مسلمانوں کی یہ حالت نہ دیکھتے۔

خود قرآن کریم میں کس قدر زور سے اور بار بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور آپ کے ہر ایک حکم کو بجا لانے کی تاکید کی گئی ہے یہ پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے اس لئے میں ان آیات کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ آیات بھی اسی کے ساتھ ہی قابل غور ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ اور آپ کے پاک اخلاق کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر صحابہؓ آپ کے اقوال و افعال کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔

حفاظت حدیث کے لئے آنحضرت صلعم کا خود تاکید کرنا

اب ہم حدیث پر غور کرتے ہیں کہ آیا حدیث میں اندرونی شہادت اس امر کی موجود ہے۔ یا نہیں کہ اس کی حفاظت کے سامان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے کوئی کئے یا نہیں۔ سو اول یہ دیکھنا چاہیئے

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے احکام کے متعلق کیا تعلیم دی ہے۔ کتاب العلم میں امام بخاریؒ نے یہ حدیث بیان کی ہے جو ابن عباسؓ کی روایت سے ہے۔ کہ جب قوم عبدالقیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار ہیں یعنی ہمارا راستہ ان کے درمیان میں سے ہی پس ہم آپ کی خدمت میں سوائے مقدس مہینوں کے حاضر نہیں ہو سکتے تو آپ نے نماز روزہ۔ زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بیان فرمانے کے بعد ان کو فرمایا احفظوہ واخبروہ من وراءکم یعنی خود ان باتوں کو خوب محفوظ رکھو یعنی اچھی طرح سے یاد کر لو۔ اور جو لوگ تمہارے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کو یہ باتیں صحیح صحیح پہنچا دو۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود حفاظت حدیث کا اور اس کو صحیح صحیح دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا واضح ثبوت ہو سکتا ہے؟ ایسا ہی مالک بن حویرث روایت کرتے ہیں قال لنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ارجعوا الی اھلیکم فعلموھم یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ حکم دیا۔ کہ اپنے گھروں میں واپس چلے جاؤ۔ اور اپنے لوگوں کو یہ باتیں جو میں نے تمہیں سکھائی ہیں۔ سکھاؤ۔ یہ بھی پہلی حدیث کی موید ہے۔ یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی نیا قبیلہ یا قوم ایمان لاتی تھی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں سے ایک شخص کو ان کی طرف بھیج دیا کرتے تھے تا وہ انہیں ان کے درمیان رہ کر احکام دین سکھا دے۔ اور پوری طرح سے دین اسلام اور اس کی شریعت سے باخبر کرے۔ ایسے لوگ ان نومسلموں کو نہ صرف قرآن کریم سکھانے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ بلکہ اس غرض سے کہ ان کو سکھا دیں۔ کہ کس طرح احکام دین کی پیروی کرنی چاہیئے۔ ایسے لوگ لازماً خود ایسے ہوتے تھے۔ جو قرآن کریم کے علاوہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ تا ان لوگوں کو جن کی طرف وہ بھیجے جاتے تھے۔ احکام دین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل سکھا دیں۔ پس نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تاکیدی حکم تھا۔ کہ آپ کے اقوال کو یاد رکھا جائے اور دوسروں کو صحیح صحیح پہنچا جائے۔ بلکہ مختلف اقوام میں جو وقتاً فوقتاً اسلام میں داخل ہوتی تھیں۔ آپ کا واعظین کو بھیجنا (تا کہ وہ ان کو احکام دین سکھا دیں)۔ اس بات کو ثابت کرتا ہے۔ کہ آپ نے اپنی زندگی میں ہی اس پر عمل بھی کرا دیا۔ اور چونکہ واعظین جو ان نئی اسلام میں داخل ہوئی ہوئی

قوموں کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ جو کچھ ان لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے متعلق بتاتے تھے۔ ان کو خود بھی یہ موقعہ ملتا تھا کہ براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصدیق کرلیں۔ اس لئے ایسی احادیث ہر قسم کی غلطی اور آمیزش سے خالی تھیں۔ کیونکہ ایسے وقت میں جب چھوٹے چھوٹے معاملات بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں وہ لوگ عرض کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے ایک امام مقرر کیا۔ تو اس کے متعلق یہ شکایت آپ کے سامنے آئی۔ کہ یہ قرأت لمبی پڑھتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ان احادیث میں جو اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہی دوسروں تک پہنچنی شروع ہوگئی تھیں کسی قسم کا تصرف ہوا ہو۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود واعظین کو مختلف اقوام کے اندر بھیجنا تاکہ وہ ان کو دین حق سے اور آپ کے حالات سے آگاہ کریں۔ یہ حدیث کی حفاظت کے سامانوں میں سے پہلا سامان تھا۔

اوپر میں یہ بھی دکھا چکا ہوں۔ کہ جب ایک قوم آپ کے سامنے آتی تو آپ ان کو چند احکام دین سکھانے کے بعد یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ کہ ان کو یاد رکھو۔ اور اپنے لوگوں کو ان سے آگاہ کرو۔ اور کئی احادیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ حدیث کو صحت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لئے ہمیشہ بہت تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے یہ حدیث بیان کی ہے عن ابن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول نضر اللہ امرأ سمع منا شیئا فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی لہ من سامع یعنی ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا فرماتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سنا تھا بعینہ اسی طرح اس کو دوسروں کو پہنچایا۔ کیونکہ بعض وہ لوگ جن کو باتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ اصل سننے والوں سے اس بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی امام بخاریؒ بھی اس مضمون کی ایک حدیث بیان کرتے ہیں عن عبد الرحمن بن ابی بکرۃ عن ابیہ ذکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قعد علی بعیرہ و امسک انسان بخطامہ او بزمامہ قال ای یوم ھذا فسکتنا حتی ظننا انہ سیسمیہ سوی اسمہ قال الیس یوم النحر قلنا بلی قال فای شھر ھذا فسکتنا حتی ظننا انہ سیسمیہ بغیر اسمہ فقال الیس بذی الحجۃ قلنا بلی قال فان دماءکم و اموالکم و اعراضکم بینکم حرام

کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا الا لیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسیٰ ان یبلغ من ھو اوعیٰ لہ منہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے۔ اور ایک آدمی نے مہار پکڑی ہوئی تھی۔ آپ نے سوال کیا یہ کونسا دن ہے ہم خاموش رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کا کوئی جدید نام بتائیں گے۔ آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں۔ یعنی ذوالحج کی دسویں تاریخ۔ ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ نے سوال کیا۔ یہ کونسا مہینہ ہے ہم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کا کوئی اور نام بتائیں گے۔ آپ نے فرمایا۔ کیا یہ ذوالحج کا مہینہ نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارا مال اور تمہاری عزت تمہارے درمیان ان سب کو وہی حرمت حاصل ہے جو تمہارے اس شہر میں اس مہینے کے اندر اس دن کو حاصل ہے۔ چاہیئے کہ جو حاضر ہے۔ وہ غائب کو میری بات پہنچا دے کیونکہ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ ایسے شخص کو خبر پہنچا دے جو شاہد کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والا ہو۔ آخری حصہ حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تاکید پائی جاتی ہے۔ کہ آپ کی باتیں دوسروں کو پہنچائی جائیں اور اس بات کا ذکر کرشاید وہ لوگ سننے والوں کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوں۔ اس لئے کیا گیا ہے کہ ان غائبین کا جو صحابہؓ سے آنحضرتؐ کی باتیں سنیں پھر یہ فرض ہے کہ وہ ان کو یاد رکھ کر دوسروں کو وہی باتیں پہنچا دیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا حاصل یہ ہے کہ آپ کی باتیں یعنی حدیث نبوی ضائع نہ ہو۔ بلکہ ایک دوسرے کو مسلمان اسے پہنچاتے رہیں۔ یہ دوسری شہادت اس امر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے۔ اور صحابہؓ کو بار بار آپ نے یہ تاکید فرمائی کہ آپ کی حدیث بلا تغیر تبدل دوسرے لوگوں تک پہنچائی جائے +

آنحضرت صلعم کے مسائل دینی کو سمجھانے اور یاد کرانے کیلئے دُہرانے کی عادت

بہت سی حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بعض ضروری باتوں کو تین تین دفعہ دُہرایا کرتے تھے۔ تاکہ سننے والے اچھی طرح آپ کی بات کو سمجھ جائیں۔ عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلثا حتی تفھم عنہ واذا اتی علیٰ قوم فسلم علیھم سلم علیھم ثلثا یعنی تین دفعہ بیان کرنے سے غرض آپ کی یہ ہوتی تھی کہ سننے والا آپ کی بات کو سمجھ جائے۔ دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے

کہ بعض صحابہؓ کو جب ایک بات سمجھ میں نہ آئے تو خود دوبارہ سہ بارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتے تھے۔ ابن ابی ملیکہ کی روایت بخاری میں ہو۔ ان عائشۃؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت لا تسمع شیئاً لا تعرفہ الا راجعت فیہ حتی تعرفہ یعنی حضرت عائشہؓ صدیقہ کے پاس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات بیان فرماتے اور وہ ان کی سمجھ میں نہ آتی۔ تو آپ بار بار پوچھتیں یہاں تک کہ اچھی طرح سے سمجھ لیتیں اب ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ایک بات کو بار بار بیان کرنا تاکہ سننے والے اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور دوسری طرف خود صحابہ کا ایک بات کو آپ سے دریافت کرنا جب پہلی دفعہ بیان کرنے سے سمجھ میں نہ آئے۔ یہ دونوں امور اس بات پر شاہد ہیں۔ کہ آپ حدیث کی صحت اور سمجھانے میں اور صحابہؓ اس کے محفوظ رکھنے اور سمجھنے میں پوری کوشش کرتے تھے۔ یہ تیسرا سامان حفاظت حدیث کا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی پایا جاتا ہے ۔

جھوٹی حدیث پر وعید چوتھا سامان حفاظت حدیث کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ وعید تھے۔ جو آپ نے حدیث میں جھوٹ بولنے والے کیلئے بیان فرمائے۔ عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار (رواہ الترمذی) ابن عباس بیان کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ مجھ سے صرف وہی حدیث بیان کرو جس کو تم جانتے ہو کہ میری حدیث ہو۔ جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ بنائے گا وہ اپنی جگہ آگ میں سمجھے۔ عن سمرۃ بن جندب والمغیرۃ بن شعبۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین۔ (رواہ مسلم) یعنی سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی حدیث بیان کرے اور وہ جانتا ہو۔ کہ یہ جھوٹ ہے۔ وہ کاذب ہے۔ بخاری میں بھی اس مضمون کی روایتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تکذبوا علی فانہ من کذب علی فلیلج النار۔ اور سلمہ کی روایت ہو۔ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یقل علی ما لم اقل فلیتبوء مقعدہ من النار اسی مضمون کی روایتیں حضرت

انسؓ ابوہریرہؓ اور زبیرؓ سے مروی ہیں۔ یہ حدیث قریباً بیس صحابہؓ سے صحیح احادیث میں مروی ہے۔ اس لئے حدیث متواتر کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صحابہؓ کس قدر محتاط حدیث کے بیان کرنے میں ہوں گے۔ میور نے اس حدیث سے نتیجہ نکالا ہے کہ اس وقت آپ پر جھوٹی حدیثیں بننی شروع ہوگئی تھیں۔ مگر یہ کس قدر احمقانہ خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور لوگ جھوٹی حدیثیں بنا کر مشہور کرنے لگ گئے ہوں۔ ان لوگوں کو یہ وہم ہے۔ کہ آخر جھوٹ بنانے سے جو ڈرایا تو اس لئے ڈرایا ہوگا کہ لوگوں کو جھوٹ بناتے دیکھا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ علم دیا (کیونکہ آپ تو امی تھے) کہ پہلے بعض بڑے بڑے لوگوں نے جو مقدس کہلاتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرف جھوٹی باتوں کو جن کو بظاہر انہوں نے اچھا سمجھا منسوب کر دیا۔ اس خیال سے کہ لوگ ان کو اس طرح پر جلد قبول کر لیں گے۔ عیسائیت کی تاریخ تو مقدس بزرگوں کے اس قسم کے جھوٹوں سے بھری پڑی ہے پس نبی کریم صلعم نے اپنی قوم کو متنبہ کیا کہ اچھی بات کو بھی منوانے کے لئے میری طرف منسوب نہ کرنا۔

صحابہ کا بیانِ حدیث میں سخت احتیاط سے کام لینا

اگر اس قسم کی احادیث کے مضمون کو اور بھی غور کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر وقت اس بات سے ترساں رہتے تھے کہ کوئی غلط لفظ ان کے منہ سے نہ نکل جائے۔ اور اس لئے جبتک کسی حدیث کے متعلق انہیں یقین کامل نہ ہوتا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے تو وہ اسے بیان کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ بخاری میں یہ حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے قال انس انه ليمنعني ان احدثكم حديثاً كثيراً ان النبي صلى الله عليه وسلم قال من تعمد على كذبا فليتبوء مقعده من النار یعنی حضرت انسؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ بہت سی حدیثیں بیان کرنے سے مجھے یہ بات روکتی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں جائے گا ایسا ہی عبد اللہ ابن زبیر سے روایت ہے قال قلت للزبير اني لا اسمعك تحدث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم كما يحدث فلان وفلان قال اما انى لم افارقه ولكن سمعته يقول من كذب على فليتبوء مقعده من النار۔ یعنی عبد اللہ بن زبیر نے اپنے والد زبیر سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں آپ کو رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم سے اس طرح حدیثیں بیان کرتا ہوا نہیں سُنتا جس طرح فلاں اور فلاں آدمی بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ اس کی یہ وجہ نہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا رہتا تھا۔ لیکن میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے۔ کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ بولے گا۔ وہ آگ میں داخل ہوگا۔ حضرت زبیر کا اس سے مطلب یہ نہیں تھا۔ کہ دوسرے لوگ جو حدیثیں بیان کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے فرمایا کہ چونکہ جھوٹ کے متعلق سخت ممانعت اور وعید عذاب ہے۔ اس لئے میں زیادہ حدیثیں بیان نہیں کرسکتا کیونکہ ان کے متعلق مجھے یقین کامل نہیں۔ کہ آنحضرتؐ نے کیا فرمایا تھا۔ کذب کے معنوں میں صرف یہی داخل نہیں۔ کہ کوئی شخص ایک خبر یا واقعہ کو غلط جان کر بیان کرے بلکہ کذب معنی خطا بھی آتا ہے۔ اور محاورہ عرب میں کذب کا استعمال ان معنوں میں بہت ہے۔ احادیث میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔ یعنی جہاں کسی شخص نے غلط واقعہ بیان کیا۔ حالانکہ وہ خود اسے غلط نہیں سمجھتا تھا۔ تو اس کے متعلق لفظ کذب آیا ہے جس کی تشریح بالاتفاق اخطأ کی گئی ہے پس جن صحابہؓ کے متعلق یہ ذکر ہے۔ کہ انہوں نے کہا کہ ہم ڈرتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کذب نہ بولیں۔ ان کا یہ منشا ہرگز نہ ہوسکتا تھا کہ ہم ڈرتے ہیں کہ جس کلام کو ہم نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنا۔ اس کو عمداً آنحضرت صلعم کی طرف منسوب نہ کردیں۔ بلکہ ذراسی بات کا ہوسکتا تھا۔ کہ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کوئی غلط لفظ یا قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو جائے۔ پس صحابہؓ آنحضرتؐ کی حدیث کی روایت کرنے میں پرلے درجہ کے محتاط تھے۔ اور اس وعید کے سبب سے کہ جو کذب علی النبی کے متعلق وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن چکے تھے وہ ایسی حدیث کے بیان کرنیکی بھی جرأت نہ کرتے تھے جس کے متعلق انہیں یہ اندیشہ ہو کہ غلط بیانی ہو جائے گی۔ اس وعید میں اور صحابہؓ کے اس کو روایات بیان کرتے وقت اس طرح مدنظر رکھنے میں ایک اور قطعی شہادت ملتی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا پورا اہتمام اس بات کا کیا کہ آپ کی احادیث کے پہنچانے میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو اور صحابہؓ نے آپ کی ان ہدایات پر پوری طرح عمل کرکے دکھایا۔

روایت حدیث میں سب صحابہ یکساں نہیں

مذکورہ بالا احادیث کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ حدیث کے سننے اس کے سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے میں سب صحابہؓ

یکساں نہ تھے بعض کو زیادہ وقت آنحضرت کی صحبت میں رہنا میسر آتا تھا بعض کو بہت کم۔ بعض فہم و فراست سے دوسروں کی نسبت زیادہ حصہ رکھتے تھے۔ اور سب کی قوت حافظہ بھی برابر نہ تھی۔ اسی فرق کی وجہ سے روایت حدیث میں بعض کا مرتبہ بعض سے زیادہ ہے مثلاً بہت سے صحابی ایسے تھے۔ کہ اپنے کام بھی کرتے تھے۔ اور فرصت کے وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے بعض نے باریاں مقرر کی ہوئی تھیں جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک انصاری کے ساتھ جو آپ کا ہمسایہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کے لئے باری مقرر کی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس دن کی خبریں اور وحی حضرت عمرؓ کو پہنچاتے۔ اور دوسرے دن حضرت عمر ایسا کرتے۔ پھر بعض صحابہؓ ان سے بھی بڑھ کر مشتاق اس بات کے تھے۔ کہ سارا وقت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے رہیں انہی میں ابوہریرہ بھی تھے جن کی حدیثیں دوسرے صحابیوں سے بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ابوہریرہ کا اشتیاق حفاظت حدیث کا اس قدر تھا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے خوب آگاہ تھے چنانچہ ایک موقعہ پر جب ابوہریرہؓ نے آنحضرتؐ سے یہ سوال کیا۔ یا رسول اللہ من اسعد الناس بشفاعتك یوم القیامة تو آپ نے قبل اس کا جواب دینے کے فرمایا۔ لقد ظننت یا اباھریرة الا یسالنی عن ھذا الحدیث احد اول منك لما رأیت من حرصك علی الحدیث یعنی آپ نے فرمایا۔ کہ اے ابوہریرہ میں اس وجہ سے کہ تمہارا اشتیاق حدیث کے لئے خوب جانتا ہوں۔ اس بات کو جانتا تھا۔ کہ تم ہی پہلے مجھ سے یہ سوال پوچھو گے (صحیح البخاری کتاب العلم) ایسا ہی صحیح بخاری میں دوسری جگہ یہ روایت حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے قال ان الناس یقولون اکثر ابوھریرة ولولا ایتان فی کتاب اللہ ما حدثت حدیثا ثم یتلوا ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات الی قولہ الرحیم۔ ان اخواننا من المھاجرین کان یشغلھم الصفق بالاسواق وان اخواننا من الانصار کان یشغلھم العمل فی اموالھم وان اباھریرة کان یلزم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لشبع بطنہ ویحضر ما لا یحضرون ویحفظ ما لا یحفظون۔ یعنی ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ ابوہریرہؓ بہت حدیثیں بیان کرتا

ابوہریرہ کا اشتیاق حفظ حدیث

ہو۔ اور اگر قرآن کریم میں دو آیتیں نہ ہوتیں۔ تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔ پھر آپ نے آیتیں پڑھتے ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ جن میں ہدایت اور بینات کے چھپانے پر سخت وعید آیا ہے۔ پھر فرمایا کہ بات یہ ہو کہ ہمارے بھائی جو مہاجرین تھے ان کو تو بازار میں خرید و فروخت روکے رکھتی تھی۔ اور ہمارے بھائی جو انصار میں سے تھے۔ ان کو اپنے کاروبار روکے رکھتے تھے۔ اور ابوہریرۃؓ کا یہ حال تھا۔ کہ دین سیکھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگا رہتا اس لئے وہ ایسے ایسے واقعات کو مشاہدہ کرتا تھا جن کو دوسرے صحابی نہیں کرتے تھے۔ اور ایسی ایسی باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر یاد رکھتا تھا جن کو دوسرے یاد نہیں رکھتے تھے پس بڑی بھاری وجہ کہ بعض صحابہ کی احادیث کم پائی جاتی ہیں۔ اور بعض کی زیادہ یہی ہے کہ بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کا زیادہ اتفاق ہوتا تھا اور بعض کو کم۔ اس کی تائید میں امام بخاری نے تاریخ میں اور حاکم نے مستدرک میں یہ روایت طلحہ بن عبید اللہ سے بیان کی ہے لاشك انه سمع من رسول الله صلى الله عليه وسلم مالم نسمع وذالك انه كان مسكينا لاشئ له ضيفا لرسول الله صلى الله عليه وسلم ایسا ہی ابن عمر کا یہ قول احمد اور ترمذی نے بیان کیا ہے۔ جو ابوہریرہ کے متعلق ہے كنت الزمنا لرسول الله صلى الله عليه وسلم واعرفنا بحديثه اور بخاری نے تاریخ میں اور بیہقی نے یہ روایت محمد بن عمارہ بن حزم سے کی ہے۔ انه قعد فی مجلس فيه مشيخة من الصحابة بضعة عشر رجلا فجعل ابوهريرة يحدثهم عن رسول الله فلا يعرفه بعضهم فيراجعون فيه حتى يعرفوه ثم يحدثهم بالحديث كذالك حتى فعل مرارا فعرفت يومئذ ان اباهريرة احفظ الناس اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی لوگ کہا کرتے تھے۔ کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دن ابوہریرۃؓ نے ایک ایسا کہنے والے سے پوچھا کہ کل عشا کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کون کونسی سورتیں پڑھی تھیں۔ وہ نہ بتا سکا۔ اور پھر آپ نے اس کو بتا دیا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوہریرۃؓ کو ابتدا سے ہی یہ شوق تھا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معمولی سے معمولی باتوں کو توجہ سے دیکھتے اور یاد رکھتے تھے۔ ان تمام واقعات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے علم کی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ اور آپ کے سامنے ہی حدیثیں پھیلنی شروع ہوگئی تھیں۔ اور آپ نے

سب وعیدان لوگوں کے لئے بیان فرمائے تھے جو آپ کی حدیث میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کریں۔ انہی تمام احتیاطوں کی وجہ سے صحابہ حدیث کے بیان کرنے میں اعلیٰ درجے کے محتاط تھے اور اس ڈر سے کہ شاید کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ بغیر یقین کامل کے کسی حدیث کو بیان نہ کرتے تھے۔ جو لوگ صحیح احادیث بیان کرنے میں اس درجہ کے محتاط تھے۔ ان کی نسبت یہ وہم کرنا کہ انہوں نے وضعی حدیثیں بنا بنا کر پھیلائیں۔ پرلے درجہ کی حماقت ہے۔

پہلی صدی کے آخر عمر بن عبدالعزیز کے احکام حفاظت حدیث کے لئے

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ پر افترا کا الزام ایک شرمناک افترا ہے۔ اور اس کی کوئی شہادت اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ جب تک صحابہ رضی اللہ عنہم زندہ رہے اس وقت تک کوئی وضعی حدیث اسلام میں نہیں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ احادیث کا وضع ہونا صحابہؓ بلکہ تابعین کے زمانہ کے بھی بعد شروع ہوا۔ اور علمائے محققین نے اس خطرہ کو محسوس کر کے جلدی اس کا تدارک شروع کر دیا۔ پہلی صدی ہجری کے اخیر تک کوئی اس قسم کی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وضع احادیث اس وقت شروع ہو چکا تھا۔ بلکہ اس امر کی تاریخی شہادتیں ملتی ہیں۔ کہ اس وقت تک اسلامی دنیا میں وضعی احادیث کا نام ونشان نہ پایا جاتا تھا۔ چنانچہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے متعلق جو پہلی صدی ہجری کے آخر میں خلیفہ ہوئے۔ یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے۔ کتب عمر بن عبد العزیز الی ابی بکر بن حزم انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذهاب العلماء ولا تقبل الا حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولیفشوا العلم ولیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یهلك حتی یکون سرا۔ یعنی خلیفہ بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو لکھا۔ (ابوبکر بن حزم آپ کے ماتحت حاکم مدینہ تھے اور خود تابعی تھے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ملے اسے نگہ رکھو اور اسے لکھ لو میں ڈرتا ہوں کہ علم (یعنی علم حدیث) گم نہ ہو جائے اور علماء سب اٹھ نہ جائیں۔ اور سوائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے اور کچھ قبول نہ کرو اور چاہیے کہ علم کو پھیلایا جائے۔ اور علمی مجالس ہوا کریں۔ تاکہ جو لوگ (حدیث سے) ناواقف ہیں۔ ان کو تعلیم دی جائے۔ کیونکہ علم نابود نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ مخفی نہ ہو جائے۔ ابو نعیم نے اپنی تاریخ اصبہان

میں لکھا ہے۔ کہ یہ حکم صرف حاکم مدینہ کے نام ہی نہیں بھیجا گیا تھا۔ بلکہ تمام صوبوں کے حاکموں کے نام یہی حکم خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے بھیجا تھا۔ خواہ یہ حکم ایک حاکم کے نام بھیجا گیا ہو۔ باسکے میں جو استدلال اس سے کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس وقت تک جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم لکھا۔ جو تاریخی طور پر ثابت ہے۔ مسلمانوں کے درمیان وضعی احادیث پیدا نہ ہوئی تھیں۔ اور یہ بات اس حکم کے الفاظ پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ امیرالمومنین نے جس بات کا اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے۔ کہ علماء مرتے جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ علم حدیث گم ہو جائے۔ اس لئے تم تمام حدیثوں کو جو تمہیں ملیں لکھ لو۔ اور وضعی حدیث کا نام تک بھی نہیں لیا۔ اگر وضعی احادیث اس وقت پیدا ہو گئی تھیں۔ تو بڑا خطرہ یہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ کہ علماء مر جائیں گے تو علم حدیث گم ہو جائے گا۔ بلکہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وضعی احادیث بکثرت مروج ہو گئی ہیں۔ اور صحیح احادیث کو ان سے الگ کرنا ضروری ہے۔ مگر اس حکم میں وضعی احادیث کا نام تک بھی نہیں پایا جاتا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وضعی احادیث کا وجود بھی نہ تھا جس بات کا خطرہ ہار بار ظاہر کیا ہے۔ وہ یہی ہے کہ علم مخفی ہو کر نابود ہو جائے گا اور اس غرض کے لئے نہ صرف یہ حکم دیا کہ حدیث لکھ لی جائے بلکہ یہ بھی حکم دیا۔ کہ علمی تذکرے بڑھائے جائیں۔ اور علمی مجالس منعقد کی جائیں۔ تا ناواقف لوگ بھی احادیث سے واقف ہو جائیں۔ اور یہ جو کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے سوائے اور کچھ قبول نہ کیا جائے۔ اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے۔ کہ اور مثلاً کسی صحابی کا قول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے خلط نہ کر دیا جائے۔ بہرحال وضعی احادیث کا اس تحریر میں ذکر تک بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ان کی کثرت یا ان کے مروج ہونے کا ذکر ہو +

صحابہ کا حدیث کی صحت معلوم کرنیکے لئے لمبے سفر کرنا

بہت سے اور واقعات تاریخ میں پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کسی حدیث کے قبول کرنے یا اس کو آگے بیان کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ بلکہ ایک ایک حدیث کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے کی خاطر سینکڑوں میلوں کے سفر اختیار کرتے اور ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ جابرؓ بن عبداللہ کا تذکرہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ کہ ایک حدیث کی خاطر انہوں نے مدینہ سے شام کا سفر کیا۔ دیکھو باب الخروج فی طلب العلم جہاں لکھا ہے رحل جابر بن عبداللہ مسیرۃ شہر الی عبداللہ بن انیس فی حدیث واحد

یعنی جابر بن عبداللہ نے ایک مہینہ کا سفر عبداللہ بن انیس کی طرف صرف ایک حدیث کی خاطر کیا جس کا تذکرہ جابرؓ نے اپنے الفاظ میں یوں موجود ہے بلغنی عن رجل حدیث سمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاشتریت بعیراً ثم شددت رحلی فسرت الیہ شہراً حتی قدمت الشام فاذا عبداللہ بن انیس فقلت للبواب قل لہ جابر علی الباب فقال ابن عبداللہ قلت نعم فخرج فاعتنقنی فقلت حدیث بلغنی عنک انک سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخشیت ان اموت قبل ان اسمعہ۔ ایسا ہی ابو ایوب انصاری کے متعلق یہ روایت ہے۔ کہ انہوں نے عقبہ بن عامر کی طرف ایک حدیث کے سننے کے لئے لمبا سفر کیا۔ ایسا ہی ایک اور صحابی کا ذکر ہے کہ اس نے فضالہ بن عبید کو ملنے کیلئے مصر کا سفر کیا۔ کیونکہ وہ ایک حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیان کرتے تھے۔ یہ تھا صحابہؓ کا جوش اور عشق آنحضرتؐ کی حدیث کی تلاش میں کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے جو کچھ سفر کی صعوبتیں تھیں۔ وہ ان کی نظر میں ایک حدیث کے سننے کے بالمقابل ہیچ تھیں۔ اگر وضعی احادیث کا اس زمانہ میں کوئی ذخیرہ تھا جسے صحابہؓ نے قبول کر لیا تھا تو ایک ایک حدیث کی خاطر ایسے لمبے سفر اختیار کرنے کے کیا معنی تھے۔ یہی حال تابعین کا معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابو العالیہ کی روایت سے قطیبی نے بیان کیا ہے کہ کنا نسمع عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا نرضی حتی خرجنا الیہم فسمعنا منہم یعنی ہم آنحضرتؐ کے صحابیوں کی روایت سے ایک حدیث کو سنتے تھے مگر ہم صبر نہ کرتے تھے جب تک سفر کر کے خود ان صحابیوں کے منہ سے اس حدیث کو نہ سن لیں۔ اس قسم کے کئی واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ جن سب کا بیان کرنا موجب طوالت ہوگا +

آنحضرت صلعم کے سامنے بعض احادیث کا تحریر میں آجانا

احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ وہ ابتدا میں تحریر میں نہیں لائی گئیں بلکہ زبانی سلسلہ روایت سے ہی محدثین تک پہنچی ہیں۔ میور کہتا ہے۔ کہ یہ کسی صورت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ عرب اپنے حافظہ پر ایسا ہی بھروسہ کر سکتے تھے۔ جیسا تحریر پر۔ اور پھر لکھتا ہے کہ نہ صرف حافظہ پورے طور پر حدیث کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ بلکہ زبانی روایت کے سلسلہ میں غلطیوں اور مبالغہ کی آمیزش بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اب اول تو یہ کہنا کسی صورت میں صحیح نہیں۔ کہ پہلی صدی کے آخیر تک حدیث کا کوئی حصہ بھی لکھا نہیں گیا۔ ایسی روایات بکثرت موجود ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے وقت میں بھی بعض لوگ حدیث کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمرو حدیث لکھا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے پاس بھی لکھی ہوئی حدیث کا موجود ہونا ثابت ہے۔ فتح مکہ والے سال میں خزاعہ نے بنی لیث کا ایک آدمی بطور کسی گزشتہ خون کے قصاص کے مار ڈالا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ پڑھا۔ اور جب آپ تمام کر چکے تو اہل یمن سے ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھے یہ خطبہ لکھوا دیجئے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔ کہ اسے لکھ دیا جائے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب آنحضرتؐ نے خطبہ پڑھا تو لوگوں نے اسے اپنے حافظوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ ورنہ بعد میں لکھا کیونکر جاتا۔ یہ تمام روایتیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ اور ان سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی بعض صحابہؓ حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے۔ اور ایسا ہی یہ بھی شہادت ملتی ہے۔ کہ لکھنے کا رواج آپ کے بعد اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ یہ بات میور کو بھی تسلیم کرنی پڑی ہے۔ کیونکہ ایک موقعہ پر وہ لکھتا ہے۔ کہ اگر ان باتوں کو جو پیش کی جاتی ہیں تسلیم بھی کر لیا جائے تو ان سے اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ کہ بعض صحابہؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تحریری یادداشتیں تھیں۔ مگر وہ لکھتا ہے۔ کہ جو کتب احادیث اُس وقت موجود تھیں۔ ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ کونسی احادیث کسی محدث نے تحریری یادداشت سے لی تھیں۔ اور کونسی صرف زبانی روایت کے سلسلے سے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی طریق درست ہے۔ کیونکہ اگر کسی حدیث کے متعلق سلسلہ روایت کو چھوڑ کر صرف اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا۔ کہ یہ حدیث کسی پرانی یادداشت سے لی گئی ہے۔ تو اول تو تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا۔ کیونکہ سلسلہ روات کے معلوم ہونے پر تو حدیث پر رجح بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن صرف ایک پرانی یادداشت کا حوالہ دینے سے آئندہ نسلوں کو یہ کیونکر معلوم ہو سکتا کہ وہ یادداشت کیسی تھی یا کس شخص کی لکھی ہوئی تھی۔ پس ایسی حدیثیں بالکل پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتیں۔ اور یہ بات صاف ہے۔ کہ ایسی یادداشتوں کا اول تو محفوظ رکھنا آسان امر نہ تھا۔ اور پھر بڑی مشکل یہ پڑتی کہ یہ کیونکر معلوم ہوتا۔ کہ فلاں یادداشت واقعی فلاں صحابی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ یا بعد میں کسی نے جعل بنا لیا ہے۔ کیونکہ زبانی سلسلہ میں تو ہر ایک راوی کا نام ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ اور ایک ایک تنقید کے نیچے آ سکتا ہے۔ مگر تحریری یادداشتوں میں ایک ایسے زمانہ میں جب چھاپہ خانہ کا رواج نہیں

تھا۔ اور اس لئے عام طور پر کوئی تحریر مشتہر نہ ہو سکتی تھی۔ کہ سب لوگ یقین کر لیں۔ کہ فلاں بات کے لکھنے والا واقعی فلاں شخص ہے۔ ایسے زمانہ اور ان حالات میں اگر تحریری یادداشتوں سے حدیثیں جمع کی جاتیں تو وہ ایسی مشتبہ ہو جاتیں کہ بالکل قابل اعتبار نہ رہتیں۔ علاوہ ازیں محدثین خود کب اس بات پر مطمئن ہو سکتے تھے۔ کہ ایک یادداشت ان کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ خود اپنی تنقید سے کام نہ لے سکتے تھے۔ بلکہ لازماً سلسلہ رواۃ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ جبتک راویوں کے ذریعہ سے کوئی حدیث کسی صحابی تک نہ پہنچ جائے۔ اس وقت تک وہ قطعاً اس کے متعلق مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ تحریری یادداشتیں اصل میں ابتدا میں بھی حافظہ کو تازہ کرنے کے لئے تھیں۔ اور محدثین نے بھی ان سے یہی کام لیا یعنی ان کو بطور تائیدی شہادت قبول کیا۔ اسی لئے ان کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی +

عام طور پر حدیث کے نہ لکھا جانے کے وجوہات

مگر معترض کہتا ہے۔ کہ اگر تحریری یادداشتیں رکھی بھی گئیں تو صرف چند حدیثوں کی رکھی گئیں۔ اور عام طور پر حدیث لکھنے کا رواج ابتدائی زمانہ میں نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی احادیث کے لکھنے سے روکا۔ اور آپ کا اس ممانعت سے یہی مطلب تھا۔ کہ عام طور پر حدیث کو نہ لکھا جائے جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ چونکہ قرآن جیسے جیسے نازل ہوتا تھا۔ لکھا جاتا تھا۔ اور اس کا لکھنا ضروری تھا۔ اس لئے اس اندیشہ سے کہ مبادا حدیث کے عام طور پر لکھا جانے سے قرآن کریم اور حدیث خلط ملط نہ ہو جائیں۔ آپ نے حدیث کے لکھنے کی ممانعت کی۔ اور جہاں ایسا اندیشہ نہیں تھا۔ وہاں لکھنے کی اجازت بھی دی۔ کیونکہ آپ کی اجازت سے حدیثوں کا لکھا جانا بھی ثابت ہے۔ عام طور پر حدیث کے لکھا جانے میں ایک اور خطرہ بھی تھا۔ وہ یہ کہ اگر حدیث کے لکھنے کا رواج ہو جاتا۔ تو حدیث کو زبانی یاد رکھنے کی ضرورت بالکل مفقود ہو جاتی۔ اور اس طرح پر زبانی روایت کا سلسلہ قطعاً موقوف ہو کر صرف یادداشتوں پر حدیث کی بنا رہ جاتی۔ جس میں تبدیل کی گنجایش بہت زیادہ ہوتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کے لکھنے میں یہ وقت کیوں پیش نہ آئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ قرآن کریم اور حدیث کا مقابلہ اس پہلو پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن شریف کی ہر ایک آیت سینکڑوں آدمی اس کے نازل ہوتے ہی حفظ کر لیتے تھے۔ اور اس کا تحریر میں لانا حفاظت کے لئے ایک زاید سامان تھا۔ علاوہ ازیں قرآن شریف عام طور پر نمازوں میں پڑھا جاتا تھا۔ اور اس کی کوئی آیت چھپی

نہ رہ سکتی تھی۔ اس کے لئے ابتدا سے ہی یہ سامان تھا۔ کہ الگ الگ سورتیں تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کے نازل ہوتے ہی فرما دیا کرتے تھے۔ کہ یہ آیت فلاں سورۃ میں فلاں مقام پر رکھی جائے۔ لیکن حدیث کو یہ باتیں حاصل نہ تھیں۔ بعض احادیث اس میں شک نہیں، ایسی تھیں۔ کہ تمام مسلمانوں کے لئے ان کا جاننا ضروری تھا۔ مثلاً احکام نماز، زکوٰۃ وغیرہ۔ مگر بہت سی حدیثیں ایسی تھیں۔ کہ وہ کل صحابہؓ کے علم میں نہ آسکتی تھیں۔ ایک شخص ایک وقت آیا اور اس نے کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی۔ وہ بات اپنے وقت پر ہوگئی اور کسی صحابی نے چونکہ اس وقت موجود تھا۔ اس کو یاد رکھ لیا۔ مگر قرآن کریم کی آیات کی طرح احادیث کا عام طور پر اعلان نہ ہوتا تھا یعنی آیت جب نازل ہوتی۔ تو اس کو لکھ بھی لیا جاتا اور عام طور پر اس کا اعلان بھی ہو جاتا۔ حافظ لوگ اس کو مطابق ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جگہ پر رکھ کر یاد بھی کر لیتے۔ اور عام طور پر مسلمانوں میں پڑھا جاتا۔ غالی لکھنا کافی نہ تھا۔ اور نہ ہی غالی لکھ لینا حدیث کے لئے کافی ہوتا۔ بلکہ مشکلات اور بھی بڑھ جاتیں۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے۔ کہ قرآن کریم کے جمع کرنے کی وجہ یہ تھی۔ کہ حافظہ پر اعتبار نہ تھا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب جمع کے لئے اولاً ابوبکرؓ کو تحریک کی۔ تو وجہ یہ بیان کی کہ بہت سے حافظان قرآن یمامہ کی لڑائی میں شہید ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ قرآن کریم کے لکھے ہوئے اجزا کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ تا ایسا نہ ہو کہ تمام حافظوں کی موت سے قرآن کریم کا کوئی حصہ مشتبہ ہو جائے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ پر اعتبار تو تھا۔ مگر ڈر یہ تھا۔ کہ جن لوگوں نے کل قرآن کریم کو حفظ کیا ہوا ہے۔ وہ جنگوں میں شہید ہو کر سب کے سب دنیا سے اٹھ نہ جائیں۔ غرض کہ قرآن کریم کی حفاظت کے لئے علاوہ تحریر کے اور بہت سے سامان موجود تھے۔ جو حدیث کو میسر نہ آسکتے تھے۔ اس لئے اس کی حفاظت کا طریق صرف حافظہ کو ہی قرار دیا گیا۔ جب تک کہ وہ وقت نہ آگیا۔ کہ حدیث کا علم کافی طور پر پھیل کر اس قابل ہو گیا کہ اسے کتابوں میں جمع کر دیا جائے۔ اس قدر ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ حدیث کی ایسی حفاظت نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی جیسی قرآن کریم کی ہوئی۔ مگر تاہم تاریخی شہادت حدیث کی حفاظت کی بھی کافی موجود ہے۔

عربوں کا حافظہ پر بھروسہ | کہا جاتا ہے کہ حافظہ پر اس قدر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا جس قدر تحریر پر۔ یہ قول اس زمانہ کے لئے تو بیشک درست ہے لیکن ابتدائی زمانہ میں بالخصوص

عرب کے حافظے نے جو حیرت انگیز کارروائیاں دکھائی ہیں۔ وہ آج کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ اگر عرب میں حافظہ ایسا ہی ناقابل اعتبار ہوتا جیسا کہ میور کہتا ہے۔ تو آج نہ عرب کی جاہلیت اور ابتدائی اسلامی زمانہ کے اشعار ہی ہم تک پہنچتے اور نہ ہی لغت اور نحو کے علوم کی ان باریک باتوں تک ہم پہنچ سکتے جن سے آج ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں عربی اشعار بعینہ اسی طرح کے سلسلہ رواۃ سے ہم تک پہنچے ہیں جس طرح احادیث۔ اور اصل بات یہ ہے۔ کہ یہی ایک طریق اس زمانہ میں کسی علم کی حفاظت کا تھا۔ اشعار کے راوی نہ صرف کثرت سے شعر ہی زبانی سلسلہ روایت سے بیان کر سکتے تھے۔ بلکہ وہ شاعروں کے نام اور ان کے حالات سے بھی واقف ہوتے تھے۔ اور ان کے شعروں میں جو حوالے ہوتے تھے۔ ان سے بھی خوب آگاہ تھے۔ شعروں کے مشہور راویوں میں سے ایک اصمعی ہیں جنہوں نے اپنے متعلق لکھا ہے۔ کہ قبل بلوغت کو پہنچنے کے میں نے بارہ ہزار شعر حفظ کر لئے تھے۔ (عقد الفرید) کیا ان لوگوں کے لئے جن میں ایسے حافظہ والے لوگ موجود تھے۔ چند ہزار حدیث کا یاد کر لینا کوئی مشکل امر تھا۔ ابو ضمضم کے متعلق اصمعی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک موقعہ پر چند نوجوان بعد عشا کے اس کے پاس پہنچے اور بیان کیا کہ ہم تم سے کچھ باتیں سننا چاہتے ہیں۔ اس نے ان کو ایک سو شاعروں کے شعر سنائے جن سب کا نام عمر تھا۔ شعبی کہتا ہے۔ کہ میں نے شعر سے کمتر روایت کسی علم میں نہیں کی۔ اور شعر میں میری روایت اس قدر ہے کہ اگر میں چاہوں تو برابر ایک مہینہ تک شعر پڑھتا چلا جاؤں اور کوئی شعر دوبارہ نہ آئے گا۔ پس اگر اس قدر اشعار جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے محض زبانی سلسلہ رواۃ سے اسلام سے بھی پہلے زمانہ سے ہم تک پہنچ گئے تو میں نہیں سمجھتا کہ حدیث کے اس سلسلہ سے پہنچنے میں مخالفین کو کونسی دقتیں نظر آتی ہیں +

یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ شعر کا سلسلہ روایت یوں ہی کوئی لغو کام تھا۔ بلکہ لغت اور نحو کی بنا انہی اشعار پر ہے۔ جو زبانی روایتوں سے پہنچے ہیں۔ ہر زمانہ میں جب کبھی کسی لفظ کے معنوں میں یا کسی نحو کے قاعدہ میں تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ تو شعر کی سند سے اس کا آخری فیصلہ ہوتا رہا ہے۔ اور کسی نے آج تک یہ اعتراض نہیں کیا۔ کہ یہ شعر تو زبانی روایت سے مدت تک چلا آیا تھا۔ اور بہت دیر بعد تحریر میں آیا۔ اس کا اعتبار کچھ نہیں پس تعجب ہے۔ کہ جس صورت میں نازک ترین مسائل لغت یا نحو صرف زبانی یادداشتوں کی بنا پر

حل کئے جا سکتے ہیں۔ تو حدیث کے لئے اتنا شور کیوں مچایا جاتا ہے۔ کہ زبانی روایتوں کے ہونے کی وجہ سے اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ صحابہؓ میں کثرت سے ایسے لوگ تھے جن کو پرانے شعر یاد تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ کو بھی کئی ہزار شعر جاہلیت کے یاد تھے۔ تو کیا کئی سو حدیث وہ یاد نہ رکھ سکتی تھیں۔ ابن عباس کے متعلق یہ واقعہ دیوان عمر ابن ابی ربیعہ کے شروع میں لکھا ہے کہ جب عمر چند شعر بنا کر ان کے پاس مشورہ کے لئے لایا کہ آیا یہ شائع کرنے کے قابل ہیں۔ یا نہیں۔ تو آپ نے صرف ایک ہی دفعہ اس سے سن کر دوبارہ سب کے سب خود سنا دیئے یہ قریباً ستر شعر تھے۔ اس پر بعض حاضرین نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ شعر آپ کو پہلے معلوم تھے تو آپ نے ان کے تعجب پر تعجب کر کے جواب دیا او یسمع احد شیئا ولا یحفظہ یعنی کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ آدمی ایک بات کو سنے اور پھر اسے یاد نہ رکھے۔ کیا ایسے انسان کے لئے اڑھائی سو حدیث کا یاد رکھنا کوئی مشکل امر تھا۔ غرضکہ یہ کہنا کہ حدیث اس لئے قابل اعتبار نہیں کہ ایک سو سال تک صرف حافظوں پر ہی اس کا انحصار رہا۔ اعلیٰ درجہ کی جہالت ہے +

تحریر میں غلطی کا امکان کم نہیں | یہ امر کہ جس چیز کا انحصار حافظہ پر ہو اس میں غلطی اور مبالغہ کا اندیشہ ہے حدیث کو پایہ اعتبار سے گرا نہیں سکتا۔ کیونکہ اگر حافظہ کا یہ حال ہے۔ تو تحریر کہاں اس سے خالی ہے۔ اس زمانے میں بھی جبکہ ادنیٰ تکلیف سے صحیح واقعات معلوم ہو سکتے ہیں۔ ہزار ہا ایسی غلط باتیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن کو سن کر ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے متعلق جس سے دھرم سالہ اور کانگڑہ تباہ ہوئے بعض انگریزی اخباروں نے یہ لکھا کہ کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ زلزلہ سے تباہ ہو گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اخباروں کو صحت اور غلطی کی چنداں پروا نہیں ہوتی۔ تو ایسی ہی غلطیاں ہم دوسری تحریروں سے نکال کر دکھا دیں گے۔ ہیزل کا اینوئل جو ایک مشہور اور مستند کتاب ہر قسم کے حوالجات کے لئے سمجھی جاتی ہے اس میں اس زلزلہ کا ذکر لکھتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ ایک سخت زلزلہ نے ایک وسیع ضلع میں جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے۔ عام تباہی اور سخت نقصان کیا۔ اور پھر لکھا ہے۔ کہ خاص دھرم سالہ میں پانچ سو آدمی مرے۔ پھر ایک شخص نے بڑے بڑے زلزلوں کا حال ایک جگہ لکھتے ہوئے اس زلزلہ کے متعلق لکھا ہے۔ کہ اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے۔ حالانکہ گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہیں ہوئے۔ یہ میں نے صرف ایک واقعہ کے متعلق چند غلطیوں کا ذکر کیا ہے۔ تا معلوم ہو کہ تحریر اور پھر اس زمانہ کی تحریر کہاں تک غلطیوں کی آمیزش

سے پاک ہے۔ باقی رہی پرانی لکھی ہوئی یادداشتیں جو اتفاقاً ہاتھ لگ جائیں ان پر ایسا اعتبار کر لینا کہ گویا ان کا لفظ لفظ صداقت سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بھی ایک سخت غلطی ہے۔ بلکہ جہاں زبانی سلسلہ روایت میں ہر طرح سے جرح اور تنقید ہو سکتی ہے۔ ایسی تحریریں بالکل کسی تنقید کے ماتحت نہیں آسکتیں۔۔ اس لئے پایہ اعتبار سے گری ہوئی سمجھنی چاہئیں +

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے۔ کہ احادیث کا زبانی یاد رکھنا کوئی ایسا کام نہ تھا جس کے وہ لوگ عادی نہ ہوں۔ بلکہ ان کے لئے یہ ایک معمولی سی بات تھی اس لئے تحریری یادداشتیں اگر موجود بھی تھیں۔ تو محدثین نے معتبر روایت کو ہی مانا ہے۔ اور تحریر کی تائید بھی جب تک روایت سے نہ ہو یا کم از کم تحریر کے متعلق روایت نہ ہو اسے کوئی وقعت نہیں دی۔ امام بخاری کو چھ لاکھ حدیث یاد تھی اور انہوں نے ایک کو بھی لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بلکہ کئی لوگ اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کا آپ کے حافظہ سے مقابلہ کر کے اپنی تحریری یادداشتوں کو درست کیا کرتے تھے +

ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث میں جھوٹ کی ملاوٹ صحابہؓ کے وقت تک یعنی پہلی صدی ہجری کے اختتام تک ہرگز نہیں ہوئی بلکہ جب صحابہؓ کُل اس دنیا سے گزر گئے۔ اور اکثر تابعین بھی انتقال کر چکے۔ تو اس وقت جھوٹی حدیثوں کا بننا شروع ہوا۔ مگر اس خطرہ کو فی الفور علماء نے محسوس کر کے جمع حدیث کا کام شروع کر دیا +

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جمع حدیث کا شوق

پس یہ ظاہر ہے۔ کہ جمع حدیث کا کام ایک حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی صحابہؓ اس وقت اس کام میں نہایت سرگرمی سے مصروف تھے۔ کہ آپ کی احادیث کو یاد کریں۔ اور دوسروں تک پہنچائیں آنحضرتؐ کی وفات کے بعد جمع حدیث کا کام اور بھی زیادہ شوق اور دلچسپی سے کیا جانے لگا۔ جیسا کہ میں نے مثالیں بیان کر کے دکھایا ہے۔ کہ کس طرح ایک ایک حدیث کی خاطر بعض صحابہؓ نے بڑی بڑی مشقتیں اٹھا کر لمبے لمبے سفر کئے۔ اور شام اور مصر تک پہنچے۔ اصل میں یہ سب کوششیں حدیث کے جمع کرنے کے لئے ہی تھیں۔ یہ بھی دکھایا جا چکا ہے۔ کہ بعض صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تحریری یادداشتیں حدیثوں کی لکھ لیا کرتے تھے۔ اور آپ کی وفات کے بعد احادیث کا تحریر میں لانا اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں زکوٰۃ کے متعلق تمام احکام لکھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ حضرت انسؓ کی حدیث سے پایا جاتا ہے کہ آپ انہی احکام کی نقل کر کے عاملوں کو بھیجا کرتے تھے۔ پس جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ جمع حدیث

کا کام ایک سو سال کے بعد شروع ہوا۔ تو اس وقت تو ہمارا یہ منشا ہوتا ہی۔ کہ اس سے پہلے حدیث کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا۔ اور نہ ہی یہ منشا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے محدثین موجود نہ تھے۔ جو حدیثوں کو جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کرتے۔ اور پھر یہ مجموعہ دوسروں کو سکھاتے تھے اور نہ ہی یہ منشا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حدیث کا لکھا جانا ثابت نہیں۔ بلکہ اس وقت جمع حدیث سے ہمارا منشا تدوین حدیث ہوتا ہے یعنی احادیث کا کتابوں میں ابواب کی تقسیم اور ترتیب کے ساتھ لکھا جانا۔ سو انہی آخری معنوں میں جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے کے آخر پر یا اس کے بعد شروع ہوا۔ اور اس کی تکمیل حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاری علیہ الرحمۃ نے کی جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو عمداً یا غلطی سے گڑبڑ کر دینے سے حدیث کی صداقت پر بہت سے اعتراض پیدا ہوئے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو کہدیا جاتا ہے کہ جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا اور پھر مراد اس سے یہ لی جاتی ہے۔ کہ گویا اس سے پہلے حدیث کو نہ لوگ اکٹھا کیا کرتے تھے۔ نہ اس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور نہ ہی اس کی حفاظت کا کوئی سامان تھا پس سب سے اول یہ ضروری ہے۔ کہ جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ اور ان کو الگ الگ رکھا جائے۔ اور اس بات کو دل میں بٹھا لیا جائے کہ امام مالک کی موطا اور امام بخاری کی صحیح سے پہلے بھی حدیث کو جمع کیا جاتا تھا۔ اور اس کی حفاظت کے سامان موجود تھے اور اس کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

جمع حدیث کے پانچ مرحلے
پہلا مرحلہ خود زمانہ نبوی ہے

غور سے دیکھا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ جمع حدیث کا کام پانچ مرحلوں میں سے ہو کر گزرا ہے۔ سب سے اول مرحلہ اس کا زمانہ نبوی ہی۔ اس بات کو میں ثابت کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہت سے صحابی خاص توجہ اور شوق سے آپ کے اقوال کو جمع کرتے اور آپ کے ہر ایک فعل کو نظر غور سے دیکھ کر یاد رکھتے تھے۔ یہی سب سے پہلے محدثین تھے ان میں سب سے بڑھ کر شوق رکھنے والے حضرت ابوہریرہؓ تھے جن کا شوق جمع حدیث کا اس قدر بڑھا ہوا تھا۔ کہ آپ حتی الوسع ہر وقت آنحضرتؐ کے ساتھ لگے رہتے۔ اور جمع حدیث کے سوائے آپ کا کوئی شغل نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لئے دعا بھی کی تھی جس کے بعد حدیث کو یاد رکھنے میں خدا تعالیٰ نے آپ کو خاص قوت بخشی تھی۔ آپ کے علاوہ بعض اور صحابی ایسے تھے جن کو آپ کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے

جمع حدیث کا خاص موقعہ حاصل تھا۔ جیسے اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت انس بن مالک جو کئی سال تک آپ کے خادم رہے۔ اگرچہ صدیقہ کے سوا اور بھی ازواج مطہرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں۔ مگر جو قابلیت اللہ تعالیٰ نے صدیقہ کو جمع اور حفاظت حدیث کے لئے دی تھی۔ وہ اوروں میں نہیں پائی جاتی تھی۔ آپ کو ہزارہا اشعار ایام جاہلیت کے شعرا کے یاد تھے اور آپ کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ اور علم سے خاص دلچسپی اور محبت تھی ایسا ہی بعض اور صحابی تھے جن کو خداداد قابلیت کے علاوہ موقع بھی ایسا مل گیا تھا۔ کہ وہ جمع اور حفاظت حدیث کا کام کرتے تھے۔ جیسے عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباس یہ دونوں نوجوان علم دین میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اور بہت سی احادیث انہوں نے جمع کیں اور لوگوں تک پہنچائیں۔ عبداللہ بن عمروؓ بھی جمع حدیث کا کام کیا کرتے تھے۔ اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ کہ وہ حدیثوں کو لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ ایسا ہی کئی اور صحابی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حدیثوں کے یاد رکھنے میں بہت شوق ظاہر کرتے تھے اور یہ کام جو وہ کر رہے تھے دراصل جمع حدیث کا بنیادی پتھر تھا۔

جمع حدیث کا دوسرا مرحلہ زمانہ صحابہ ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمع حدیث نبوی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ علاوہ ان چند صحابیوں کے جو آپ کی زندگی میں ہی جمع حدیث کا کام کرتے تھے۔ ہزارہا اور صحابہؓ تھے۔ اور ان میں بہت سے ایسے تھے جو کوئی نہ کوئی ایسی حدیث یاد رکھتے تھے جو عام طور پر شہرت یافتہ نہیں تھی۔ پس اس مرحلہ پر جمع حدیث کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان تمام سرچشموں سے حدیث کو اکٹھا کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک مشکل کام تھا۔ مگر ضروریات زمانہ نے اس کو کسی طرح سے آسان کر دیا تھا۔ سب سے اول جیسا کہ ہم پہلے بھی دکھا چکے ہیں۔ ہر ایک صحابی جو کسی حدیث کو یاد رکھتا تھا۔ وہ اسے اپنا مقدم فرض سمجھتا تھا۔ کہ اسے دوسروں تک پہنچا دے۔ کیونکہ ان کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم انہیں دی تھی۔ کہ لیبلغ الشاھد الغائب۔ آنحضرت کی وفات کے تھوڑے دن پیچھے مخبر صادق کی پیشگوئی کے مطابق صحابہؓ دور دراز ملکوں میں پھیل گئے تھے اور ہر جگہ انہوں نے حدیث کا چرچا پھیلا دیا تھا۔ اور جو جو احادیث ان کو معلوم تھیں وہ دوسروں تک پہنچا دی تھیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں احادیث کی مدرس کا سلسلہ شام مصر وغیرہ ممالک میں پھیل گیا تھا۔ یہاں یہ سلسلہ نسلاً بعد نسل اس وقت تک

جاری رہا جب تدوین حدیث کا وہ زمانہ پہنچا۔ کہ محدثین نے جا بجا پھر کر کل احادیث کو کتابوں میں اکٹھا کر دیا +

دوئم آنحضرتؐ کے بعد خلفاء کے زمانے میں کئی صحابی ایسے تھے۔ جنھوں نے آنحضرتؐ کے کسی قول کی بنا پر بعض حقوق طلب کیے۔ اور ان حقوق کے دیا جانے یا ان کے انکار کے وقت آپ کی بہت سی احادیث کی تصریح ہو گئی۔ اور وہ عام طور پر شہرت پا گئیں۔ مثلاً مغیرہؓ نے ایک حدیث کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ سے بعض حقوق طلب کیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گواہ طلب کیا۔ اور جب آپ کا اطمینان ہو گیا کہ واقعی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ تو آپ نے وہ حقوق اسے عطا فرما دیئے۔ پس اس طرح پر یہ حدیث عام شہرت پا گئی۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں جن کا علم پہلے چند اشخاص تک محدود تھا۔ عام طور پر شائع ہوتی اور پھیلتی رہیں۔ اور علم حدیث کے مجموعہ میں شامل ہو گئیں۔ سوئم نئی نئی ضرورتیں جو مسلمانوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں پیش آتی تھیں۔ بہت سی حدیثوں کی اشاعت کا موجب ہو گئیں۔ کیونکہ جب کبھی کوئی مقدمہ یا تنازعہ یا کوئی امر فیصلہ طلب پیش ہوتا۔ تو قرآن کریم کے بعد سب سے پہلے حدیث کی طرف ہی صحابہؓ رجوع کرتے تھے۔ اور جہاں امر پیش آمدہ پر کوئی حدیث پوری پوری منطبق نہ ہوتی تو اس کے قریب قریب کوئی حدیث تلاش کی جاتی اور اس پر قیاس کر کے امر پیش آمدہ کا فیصلہ کیا جاتا۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ اس صورت میں احادیث کی اچھی طرح پڑتال کی جاتی ہو گی تاکہ عین مطابق واقعہ کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مل جائے۔ اور آپ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ ہو جائے جو صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمع حدیث میں شہرت رکھتے تھے اول ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی باوجود نوجوان ہونے کے محض ان کے علم قرآن اور حدیث کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اور ایسے معاملات ان سے دریافت کر لیا کرتے تھے۔ چہارم ضروریات اور نئے پیش آمدہ امور کو الگ چھوڑ کر صحابہؓ تلاش حدیث میں سرگرم رہتے تھے۔ کیونکہ وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی الفاظ آیندہ نسلوں کو پہنچنے سے رہ جائیں۔ چنانچہ جہاں کہیں کسی حدیث کی روایت کا ذکر سنتے تھے۔ فوراً اس جگہ پہنچ کر بعد تحقیق اس حدیث کو اپنے علمی ذخیرہ میں شامل کر کے دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ دراصل صحابہؓ کے زمانہ میں جمع حدیث کے لئے اول ان حدیثوں

کی اشاعت ضروری تھی۔ تاکہ عام طور پر معلوم ہو کر وہ حدیثیں محدثین کے ذخیرہ علم میں داخل ہو سکیں۔
پنجم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور ان میں سے بہت سے اس بات کی تلاش میں لگے رہتے تھے کہ انہیں اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات معلوم ہو جائیں جس کے زمانہ کو پا کر وہ اسلام اور آپ کی صحبت سے محروم رہے۔ ایسا ہی دین اسلام کے متعلق بھی وہ پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور یہی حال اسی نئی اسلامی نسل کا تھا جس کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اس قدر ملا ہوا تھا۔ مگر اس مبارک زمانہ کو انہوں نے نہ پایا تھا۔ یہ تمام لوگ اس تلاش میں رہتے تھے۔ کہ کسی صحابی سے مل کر اس سے حالات سنیں۔ اس ذریعہ سے حدیث کا علم اور بھی اشاعت پاتا رہا۔ پھر جوں جوں صحابہؓ دنیا سے گزرتے گئے ان لوگوں کا اشتیاق احادیث کا علم حاصل کرنے اور ان کو محفوظ رکھنے اور پھیلانے کا اور بھی بڑھتا گیا۔ ان تمام باتوں سے ہم اس نتیجہ پہنچتے ہیں۔ کہ اکثر وہ احادیث جو صحابہؓ کے علم میں آ تھیں تابعین کو پہنچ گئیں۔ ششم وہ صحابی جن کے پاس احادیث کا ذخیرہ زیادہ تھا۔ جیسے ابوہریرہؓ انسؓ بن مالک ابن عباسؓ وغیرہ وہ تدریس کے طور پر مشتاق طالبوں کو حدیثیں سنایا کرتے تھے۔ اور صحابہؓ کے زمانہ میں ہی ایسے مقامات پر حدیث کی بڑی بڑی درسگاہیں بن گئی تھیں جہاں باقاعدہ حدیث کی اشاعت ہوتی تھی۔ اور دور دور سے سننے والے جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ آٹھ سو آدمی حضرت ابوہریرہ کے حدیث میں شاگرد تھے۔ ان درسگاہوں کا قایم ہونا جمع حدیث کے دوسرے مرحلہ کا اختتام اور تیسرے مرحلہ کا ابتدا تھا +

جمع حدیث کا تیسرا مرحلہ زمانہ تابعین اور درسگاہوں میں تدریس حدیث

تیسرا مرحلہ جمع حدیث میں اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب صحابہؓ کا زمانہ گزر کر کل احادیث اکابر تابعین کے ہاتھ میں آ چکی تھیں پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے کل صحابہؓ اس دنیا سے گزر چکے تھے۔ حدیث کی درسگاہیں صحابہ کے زمانہ میں ہی قایم ہو چکی تھیں۔ اور اب اس تیسرے مرحلہ پر جمع حدیث کے لئے اس طرح پر تلاش کی ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ جیسے صحابہ کے وقت میں تھی۔ کیونکہ صحابہؓ کے زمانہ تک نئی نئی احادیث اشاعت پاتی رہتی تھیں۔ مگر اب صرف وہی احادیث آگے پہنچائی جاتی تھیں۔ جو صحابہؓ کے ذریعہ تابعین کو پہنچ چکی تھیں۔ پس عموماً حدیث کی تلاش ان درسگاہوں تک ہی محدود ہو گئی تھی جہاں علم حدیث کا چرچا ہوتا تھا۔ اور بہت کم ایسی حدیثیں تھیں جو ان درسگاہوں میں نہ آ گئی ہوں۔ اس طرح پر جہاں تک زبانی سلسلہ روایت کی تکمیل ہو سکتی تھی۔ ان درسگاہوں

کے قایم ہونے اور ان میں علم حدیث کے پڑھایا جانے سے جمع حدیث کی ایک گونہ تکمیل ہو چکی تھی لیکن اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ کسی ایک درسگاہ میں کل کی کل حدیثیں مل سکتی تھیں بلکہ جو احادیث کسی محدث یا تابعی نے صحابہ رضی اللہ سے سُن کر حفظ کر لی تھیں۔ انہیں احادیث کی اشاعت اس درسگاہ میں ہوتی تھی۔ اور پھر سفر کے ذریعہ محدثین کے علم کی وسعت ہوتی رہتی۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں حدیث کا لکھنا پہلے کی نسبت بہت زیادہ مروج ہو گیا تھا۔ اور جہاں محدثین درسگاہوں میں سُنایا کرتے تھے بہت لوگ ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ اور جو حافظہ پر پورا بھروسہ کر سکتے تھے وہ ان کو وہیں یاد کر لیا کرتے تھے امام زہری (جو ۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ میں وفات پائی) کی تالیفات کے متعلق لکھا ہے۔ کہ گدھوں اور گھوڑوں پر لاد کر لائی گئیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی پہلی صدی ہجری کے اختتام کے قریب یہ احکام نافذ کئے تھے کہ احادیث لکھ لی جایا کریں اور علمائے حدیث حدیثوں کی تدریس کے سلسلہ کو وسیع کریں تاکہ جو لوگ علم حدیث سے واقف نہیں وہ بھی واقف ہو جائیں۔ تا اس طرح پر سلسلہ روایت حدیث اور جمع حدیث میں کوئی خلل نہ آئے۔ ایسا ہی آپ نے عمرہ کے مسائل جو حضرت عائشہؓ سے مروی تھے لکھوا لئے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں حدیثیں صرف متفرق طور سے لکھ لی جایا کرتی تھیں۔ وہ کتابوں کی صورت میں نہ تھیں۔ نہ تحریر کے ذریعہ ان کی اشاعت ہی ہوتی تھی۔ بہرحال حدیث کا لکھنا عام طور پر مروج ہو گیا تھا۔ اور یہ تیسرے مرحلہ کا اختتام اور چوتھے مرحلہ کا ابتدا تھا +

جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ حدیث پر تصنیفات

دوسری صدی ہجری کے نصف کے قریب حدیث کے لکھا جانے نے ایک اور رنگ پکڑ لیا۔ اور بجائے متفرق مسودات کے جن کی اشاعت بحیثیت ایک کتاب ہونے کے نہ ہو سکتی تھی مستقل کتابیں حدیث پر لکھی جانی شروع ہو گئیں۔ اس زمانہ تک محض تحریری مسودہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ کہ واقعی ایک حدیث صحیح اور قابل اعتبار ہے۔ بلکہ یہ ضروری تھا۔ کہ معتبر سلسلہ رواۃ سے حدیث کو کسی مشہور صحابی تک پہنچایا جائے۔ اور ان تمام راویوں کے نام درجہ بدرجہ ظاہر کئے جائیں جن کے ذریعہ حدیث اس بیان کرنے والے تک پہنچی تھی۔ اس لئے ان کتابوں میں بھی پورا سلسلہ راویوں کا دیا جاتا تھا۔ یہ کتابیں اشاعت کے بعد یہ وقعت رکھتی تھیں کہ اس کی احادیث کا حوالہ دیا جائے۔ کیونکہ اس زمانہ میں تحریر کا رواج عام ہو کر کتابوں کے نسخے کثرت سے شائع ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلے جس

شخص نے حدیث کی کتاب لکھی وہ امام عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج تھے۔ جو ابن جریج کے نام سے مشہور ہیں۔ اور بعض کے نزدیک سب سے پہلے حدیث کی کتاب ربیع بن صبیح نے لکھی اور تیسری روایت ہے کہ سب سے اول سعید ابن ابی عروبہ تھے۔ یہ تمام محدثین دوسری صدی ہجری کے نصف کے قریب فوت ہوئے جس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ حدیث کی کتابوں میں لکھا جانا دوسری صدی ہجری کے نصف سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ ان کے بعد حدیث کے بڑے معتبر امام حضرت امام مالک بن انسؓ تھے جن کی کتاب موطا آج تک حدیث میں سند مانی گئی ہے۔ یہ کتاب اہل حجاز کی احادیث پر مبنی تھی۔ اور علاوہ احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس میں صحابہؓ اور تابعین کے اقوال اور فتاوے بھی درج ہیں۔ مختلف مقامات میں مختلف ائمہ حدیث نے اس زمانہ میں کتابیں لکھیں۔ چنانچہ ابن جریج نے مکہ میں۔ امام مالک نے مدینہ میں۔ سفیان بن عیینہ نے بھی تدنہ میں۔ عبداللہ بن وہب نے مصر میں۔ معمر اور عبدالرزاق نے یمن میں۔ سفیان الثوری اور محمد بن فضیل نے کوفہ میں حماد بن سلمہ اور روح بن عبادہ نے بصرہ میں ہشیم نے واسط میں اور عبداللہ بن مبارک نے خراسان میں حدیث پر کتابیں تصنیف کیں +

پانچواں مرحلہ جمع حدیث کے کام کی تکمیل

یہ تصنیفات جن کا ذکر اوپر ہوا جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ ہیں۔ اصل میں تدوین حدیث کا کام شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تک یہ کام تکمیل کے درجہ کو نہیں پہنچا تھا۔ چوتھے مرحلہ پر جس قدر تصانیف لکھی گئیں ایک تو ان کے اغراض محدود تھے یعنی ان میں ہر قسم کی احادیث نہ پائی جاتی تھیں۔ صرف خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر یہ تالیفات کی گئی تھیں اور دوسرا ان میں وہی احادیث ان مضامین کے متعلق جمع کی گئی تھیں جو اس خاص حصہ ملک میں مروج تھیں۔ مثلاً موطا کو ہی لو اس میں صرف اہل حجاز کی احادیث ہیں اور ان میں سے بھی صرف وہ احادیث جو عمل کے متعلق ہیں۔ مثلاً نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج وغیرہ کے احکام کے متعلق اور اس قسم کی احادیث جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے متعلق یا مغازی کے متعلق یا تفسیر قرآن کے متعلق وہ اس میں جمع نہیں کی گئیں۔ پس باوجود تدوین کے شروع ہو جانے کے جمع حدیث کا کام ابھی کمال کو نہ پہنچا تھا۔ بلکہ یہ کمال اسے پانچویں مرحلہ پر حاصل ہوا۔ جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جمع حدیث کا کام شروع کیا۔ اور اس کو ہر پہلو سے مکمل کر کے دکھایا امام محمد بن اسمٰعیل جو بخاری کے نام سے مشہور ہیں۔ کیونکہ بخارا ان کا اصل وطن تھا۔ اس وقت کے قریب قریب پیدا ہوئے۔ جو امام مالک کی وفات کا وقت تھا۔ اور جمع حدیث کا شوق آپکو

چھوٹی عمر میں پیدا ہوگیا۔ اور تیسری صدی ہجری کے ابتدا میں یہ کام انہوں نے شروع کر دیا۔ اور کتاب صحیح بخاری تالیف کی آپ کی وفات ۲۵۶ھ ہجری میں ہوئی یعنی تیسری صدی کے نصف کے قریب۔ ایسا ہی اسی زمانہ کے قریب آپ کے شاگرد مسلم نے جمع حدیث کا کام شروع کیا۔ اور صحیح مسلم کو تالیف کیا جس کا مرتبہ صرف صحیح بخاری سے دوسرے درجہ پر ہے۔ پھر ابوداؤد ترمذی اور نسائی نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی اپنی مسندیں تالیف کیں یہ تینوں کتابیں اگرچہ موطا صحیح بخاری اور مسلم کے مرتبہ کو نہیں پہنچتیں۔ مگر ان سے دوسرے درجہ پر معتبر کتابیں سمجھی گئی ہیں۔ ان کے مصنفوں نے ہر ایک جگہ خود سفر کر کے کل احادیث معتبر کو جمع کیا۔ اور اپنی ساری زندگیاں اسی کام کے لئے وقف کر دیں۔ یہ پانچواں مرحلہ جمع حدیث کا تھا۔ جب یہ بھی کام تکمیل کو پہنچ گیا اور معتبر احادیث کا ذخیرہ کتابوں کی صورت میں جمع ہوگیا +

ان پانچوں مرحلوں کے بغیر جمع حدیث کا کام نامکمل رہتا

اس تمام بحث سے یہ امر واضح ہوگیا۔ کہ جمع حدیث کی بنیاد تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی رکھی گئی تھی۔ مگر اس عمارت کی تکمیل امام بخاریؒ کے ہاتھ سے ہوئے۔ اور اگر حدیث کی اصلیت پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ بغیر ان پانچ مرحلوں سے گزرنے کے یہ کام تکمیل پذیر نہ ہو سکتا تھا۔ یہ پانچ مرحلے دراصل پانچ سیڑھیوں کی طرح تھے۔ اور ہر ایک مرحلہ گویا دوسرے مرحلہ کے لئے تیاری کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ سب سے اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں اگرچہ بعض صحابہؓ نے خصوصیت سے حفظ حدیث کا کام شروع کر دیا تھا۔ مگر بہت سی احادیث ایسی تھیں جن کا علم خاص خاص صحابہؓ کو تھا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ متوقعہ پیش آیا۔ کہ ایسی تمام احادیث عام اشاعت پا گئیں۔ اور خاص خاص لوگوں نے انہیں محفوظ کر لیا۔ دوسری طرف جن صحابہ کو زیادہ حدیثیں یاد تھیں انہوں نے اس زمانہ میں بذریعہ تدریس یہ احادیث آئندہ نسل کو پہنچانی شروع کیں اور جہاں جہاں صحابہؓ پھیل گئے تھے۔ اس جگہ تدریس حدیث کے مرکز قائم ہوگئے۔ اس کے بعد تیسرا زمانہ تابعین کا آیا جب حدیث کے علم کا بذریعہ تدریس عام رواج ہوگیا۔ اور مزید برآں علاوہ حفظ حدیث کے اس کی یادداشتیں لکھی جانی شروع ہوگئیں۔ اور یادداشتوں کی صورت میں نہ کتابوں کی صورت میں حدیث کی تحریر کا رواج عام ہوگیا۔ اور جو لوگ جمع حدیث کے مشتاق تھے۔ وہ ان درسگاہوں میں حاضر ہو کر جب حدیثوں کو سنتے

تو ان میں سے اکثر ان کو ضبط تحریر میں لے آئے۔ اس تحریر کے رواج سے جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ آپہنچا۔ جب بجائے الگ الگ یادداشتوں کے کتاب کی صورت میں ترتیب پاکر حدیثوں کا لکھا جانا شروع ہوگیا۔ پھر اس کے بعد پانچواں مرحلہ آپہنچا۔ جب بجائے ایک خاص مقام سے حدیثیں جمع کرنے کے یا بجائے ایک خاص مضمون پر حدیثیں جمع کرنیکے جامع کتابیں حدیث پر لکھی جانی شروع ہوئیں۔ اس طرح دو سو سال کے عرصہ میں اس عمارت کی تکمیل ہوئی۔ اور جمع حدیث کا کام ختم ہوا لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس کام کی تکمیل فی الفور نہیں ہوئی۔ اور ایک دراز عرصہ اس میں خرچ ہوا۔ حدیثوں کی بے اعتباری نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک ایک قدرتی ترقی تھی جس کے سوائے یہ کام احسن طور پر سرانجام نہ پا سکتا تھا اور یہ پانچوں مرحلے ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں جیسے زنجیر کی کڑیاں +

پانچواں باب

تنقید حدیث

میور اور سپرنگر کی رائے محدثین کی تنقید حدیث کی

اب میں اس بات کو لیتا ہوں کہ تنقید حدیث کس حد تک محدثین نے کی اور کس حد تک ہم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے پہلے سوال اول کو لیتا ہوں۔ میور سپرنگر اور معترضین نے ان کتابوں میں معتبر احادیث کے ہونے سے انکار کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے۔ کہ ان محدثین نے حدیث کے جمع کرنے میں تنقید کا طریق اختیار نہیں کیا۔ میور سپرنگر کی رائے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اور خود اسی رائے کا مؤید ہے۔ بخاری کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

"جن اصول اور قواعد کی پیروی اس نے (یعنی امام بخاری علیہ الرحمۃ نے) کی۔ ان پر تنقید کا نام چسپاں نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا تھا۔ کہ راویوں کا سلسلہ پورا ہے یعنی منقطع نہیں ہوا اور ان راویوں کے چال چلن کو دیکھ لیتا تھا۔ اور چونکہ ایک قاعدہ اس نے یہ بھی مقرر کیا ہوا تھا۔ کہ جو حدیث اس کے اپنے متعصبانہ خیالات کے مطابق نہ ہو اسے رد کر دیتا تھا۔ اس لئے اس کے کسی حدیث کو رد کر دینے سے یہ نتیجہ کسی صورت میں نہیں نکل سکتا۔ کہ وہ حدیث واقعی ناقابل اعتبار ہے مگر اس کی جامع دوسری مسندوں سے یہ امتیاز ضرور رکھتی ہے۔ کہ وہ کسی خاص مذہب کا پیرو نہ تھا۔ بلکہ صرف حدیثوں کی فرضی صحت اور راویوں کی راستبازی وغیرہ پر ہی سارا دارومدار رکھا کرتا تھا۔" ایسا ہی میور اپنے دیباچہ لائف آف محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) میں لکھتا ہے "یہ تو ظاہر ہے کہ محدثین کسی قسم کی تنقید کو کام میں لاتے تھے۔ اور وہ بھی ایسی سختی سے کہ بحساب اوسط ہزار حدیث میں سے انہوں نے قریباً ننانوے کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا۔ لیکن یورپین ناظرین سخت دھوکا کھائیں گے اگر وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ تنقید باوجود اس قدر سختی کے صحیح معنوں میں ایک کامل اور صحیح تحقیقات تھی جو احادیث کی صحت کے متعلق تھی۔ محدثین کے نزدیک کسی حدیث کے قابل اعتبار ہونے کے لئے اس حدیث کے نفس مضمون کو نہ دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ صرف ان ناموں کو دیکھا جاتا تھا جو اس حدیث کے بیان کرنے والے ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک صحیح احادیث کی سند پہلے کسی صحابی سے چلنی چاہئے۔ اور پھر راویوں کے ایک لمبے سلسلے میں ہر ایک راوی کی صداقت

اس کی بنا ہوتی تھی۔ اگر ان راویوں کی صداقت پر کوئی الزام عاید نہ ہوسکے۔ تو حدیث قبول کرنی چاہیئے بنفس مضمون میں کوئی بات خواہ کیسی ہی بعید از قیاس کیوں نہ پائی جاتی ہو۔ وہ ایسی حدیث کے اعتبار کو نہیں گرا سکتی۔ محدثین بحر تنقید میں کھلی کھلی شناوری نہ کرتے تھے بلکہ اس ایک ہی قاعدہ کے غلام ہو گئے تھے۔ اندرونی شہادت پر جرح کرنے کی ان کو قطعاً جرأت نہ تھی"

محدثین کے قرار دادہ اصول تنقید حدیث

یہ دو ایسے شخصوں کی رائے ہے جنکی رائے کو اسلام کے متعلق نہایت محققانہ اور بے لوث مانا گیا ہے۔ مگر میں افسوس سے کہتا ہوں کہ ان خیالات کے ظاہر کرنے میں ان دونوں صاحبوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جن احادیث کو محدثین نے وضعی قرار دیا ہے۔ ان کو کس بنا پر وضعی قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محدثین نے راویوں کے متعلق پوری پوری تحقیقات کرنے میں بہت ہی کوشش کی ہے۔ اور میں یہ ثابت کروں گا کہ احادیث کی صحت کو پرکھنے کے لئے اس کی ضرورت تھی مگر یہ بالکل جھوٹ ہے کہ انہوں نے اندرونی شہادت پر مطلق توجہ نہیں کی۔ بلکہ احادیث موضوعہ کے جانچنے کے لئے جو اصول انہوں نے مقرر کئے ہیں۔ وہ قریباً سب کے سب اندرونی شہادت کے ہی متعلق ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے عجالہ نافعہ میں وضعی احادیث کی مفصلہ ذیل علامات بیان کی ہیں جنہیں نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنی کتاب الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ میں ذکر کیا ہے۔ وہ علامات حسب ذیل ہیں۔ اول یہ کہ روایت تاریخ کے خلاف ہو۔ جیسا کہ کہا جائے کہ عبداللہ بن مسعود نے جنگ صفین میں یوں فرمایا حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں وفات پا چکے تھے۔ دوم یہ کہ راوی رافضی ہو اور جو حدیث وہ بیان کرے وہ صحابہ کے مطاعن میں ہو۔ یا راوی خارجی ہو۔ اور اہل بیت کے مطاعن میں حدیث بیان کرے علی ہذا القیاس۔ پھر اگر راوی اس حدیث کو بیان کرنے میں اکیلا ہو اور اور کوئی راوی اس حدیث کا نہ ہو تو ایسی حدیث منکر ہے۔ اور اگر اور لوگ بھی اس حدیث کو بیان کرنے والے ہوں تو حدیث قبول کی جائے اور اس کی مناسب توجیہ کی جائے سوئم ایسی حدیث بیان کرے جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا سب مکلفوں پر واجب ہو۔ اور راوی اس حدیث کے بیان کرنے میں اکیلا ہو۔ تو یہ مضبوط قرینہ حدیث کے جھوٹا اور موضوع ہونے پر ہے۔ چہارم یہ کہ راوی کا حال اور وہ وقت جب حدیث کو بیان کیا ہے۔ اس کے کذب پر قرینہ ہوں۔ جیسا کہ خلیفہ عباس مہدی کی مجلس میں غیاث بن ابیمون کے لئے واقع ہوا کہ جب وہ بادشاہ کے پاس حاضر ہوا۔ تو بادشاہ اس وقت کبوتروں کے اڑانے میں مشغول تھا

جس پر غیاث نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے یہ حدیث سنائی کہ لا سبق الا فی خف او نصل او جناح یعنی کوئی شرط نہیں ہونی چاہئے مگر اونٹوں (یا گھوڑوں) کی دوڑ میں اور تیر اندازی میں اور جانوروں کے اڑانے میں مگر یہ لفظ جناح (پرندوں کا اڑانا) اصل حدیث میں موجود نہ تھا بلکہ غیاث نے صرف خلیفہ کو خوش کرنے کے لئے اسے بڑھا دیا تھا۔ کیونکہ خلیفہ کو کبوتر اڑانے کا شوق تھا۔ اس قصہ کی تفصیل حیوٰۃ الحیوان الکبری میں اس طرح پر دی ہے کہ ہارون الرشید کو کبوتروں سے محبت تھی اور ان کے ساتھ وہ کھیلا کرتا تھا۔ ایک کبوتر اس کے پاس بطور تحفہ آیا۔ اور اس وقت بادشاہ کے پاس قاضی ابو البختری بیٹھا تھا۔ اور اس نے سند کے ساتھ ایک حدیث ابو ہریرہؓ سے بیان کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا سبق الا فی خف او حافر او جناح اور یہ لفظ او جناح کا اپنے پاس سے بڑھا دیا۔ خلیفہ نے اسے کچھ دے کر رخصت کیا۔ اور جب وہ چلا گیا تو کہا کہ خدا کی قسم ہے میں نے خوب سمجھ لیا ہے کہ اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا کیا ہے۔ پھر حکم دیا کہ کبوتر کو ذبح کر دیا جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کبوتر کا کیا گناہ ہے۔ کہا اس کی خاطر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا باندھا۔ پس اسی وجہ سے اور اس کی اور موضوعات کی وجہ سے محدثین اور علماء نے ابو البختری کی حدیث کو چھوڑ دیا اور کوئی حدیث اس سے نہیں لکھی۔ پنجم یہ کہ حدیث عقل اور شرع کے تقضی کے مخالف ہو۔ اور قواعد شرعیہ اس کو جھوٹا ٹھہراتے ہوں۔ جیسا کہ قضائے عمری اور حدیث مثل اس کے کہ لا تاکلوا البطیخ حتی تذنجوہ یعنی خربوزے کو نہ کھاؤ جب تک اسے ذبح نہ کر لو۔ ششم یہ کہ حدیث میں کوئی قصہ کسی ایسے امر محسوس کے متعلق ہو کہ اگر درحقیقت وہ واقع ہوا ہوتا تو لاکھوں انسان اس کو نقل کرتے مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں خطیب کو جمعہ کے دن ممبر پر قتل کر دیا گیا اور اس کی کھال اتار دی گئی اور اس واقعہ کو سوائے اس راوی کے اور کوئی بیان کرنے والا نہ ہو۔ ہفتم یہ کہ حدیث میں لفظ اور معنی رکیک ہوں مثلاً الفاظ ایسے ہوں جو قواعد عربیہ کے مطابق نہیں یا معنی ایسے ہوں جو شان نبوت اور وقار رسالت کے شایاں نہیں۔ ہشتم یہ کہ چھوٹے سے گناہ پر سخت وعید میں یا تھوڑے عمل پر بڑے ثواب کے وعدوں میں افراط کا پہلو اختیار کیا گیا ہو۔ جیسے من صلی رکعتین فلہ سبعون الف دار فی کل دار سبعون الف بیت فی کل بیت سبعون الف سریر علی کل سریر سبعون الف جاریۃ یعنی جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس کے لئے بہشت میں ستر ہزار مکان ہوں گے۔ ہر مکان میں ستر ہزار

کوٹھے ہوں گے ہر کوٹھے میں ستر ہزار تخت ہوں گے ہر تخت پر ستر ہزار لونڈیاں ہوں گی۔ بلکہ اس قسم کی کل حدیثیں خواہ وہ ثواب کے بارہ میں ہوں اور خواہ عذاب کے موضوع سمجھی گئی ہیں۔ نہم یہ کہ چھوٹے سے عمل پر عمرہ اور حج کا ثواب بتایا گیا ہو۔ دہم یہ کہ نیکی کرنے والے کے لئے کئی انبیاء اور مرسلین کے ثواب کا وعدہ ہو۔ یازدہم یہ کہ خود وضع کرنے والا اقرار کرے جیسا نوح بن عصمہ کے لئے اتفاق ہوا کہ اس نے قرآن شریف کی ایک ایک سورۃ کی فضیلت میں جھوٹی حدیثیں بنائیں اور ان کو رواج دیا اور شہرت دی جیسا کہ بیضاوی میں ہر ایک سورۃ کے اخیر میں ان کا ذکر ہے۔ اور جب محدثین نے ان حدیثوں کے متعلق تحقیق شروع کی اور اسے کہا کہ ان کی سند کو صحت کو پہنچائے اور یہ بتائے کہ اس نے یہ حدیثیں کہاں سے لیں تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے خود ہی یہ جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں +

محدثین نے اندرونی شہادت اور قرآن سے کام لیا

اب معترضین اس مقام پر غور کریں کہ ان گیارہ علامتوں میں سے جو وضعی احادیث کے لئے قرار دی گئی ہیں۔ دس علامتیں اندرونی شہادت اور قرآن کے متعلق ہیں۔ حالانکہ میور اور سپرنگر صاحبان جن کو بڑے محقق ہونے کا دعویٰ ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ محدثین کو یہ جرأت ہی نہ تھی۔ کہ وہ قرآن کی شہادت پر یا اندرونی شہادت پر تنقید کریں اس سے بڑھ کر ان لوگوں کی جہالت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے جس آزادی کے ساتھ محدثین نے احادیث پر تنقید کی ہے اس کی نظیر ہمیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ان کے نزدیک دنیوی وجاہت کوئی قابل توجہ چیز نہ تھی۔ بلکہ بڑے سے بڑے آدمی کے چال چلن پر وہ اسی طرح تنقید کرتے جیسے معمولی آدمی پر۔ اور جب ان کو یہ ثابت ہو جاتا۔ کہ ایک شخص نے عمداً ایک لفظ بھی جھوٹا حدیث میں ڈال دیا ہے۔ تو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہوتا۔ مگر اس کی روایت کو وہ ہرگز نہ لیتے اصل بات یہ ہے کہ قرآن کی شہادت اور اندرونی شہادت پر محدثین اسی طرح سے تنقید کی جیسے راویوں کے حالات وغیرہ کے متعلق۔ اور یوں حدیث کو بلحاظ صحت ایسے مرتبہ پر پہنچایا جو عیسائیوں کی کتب مقدسہ کو بھی میسر نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کے قبول کرنے میں نہ بروئے روایت کوئی تنقید کی گئی اور نہ بروئے درایت۔ اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کہ کیوں محدثین نے راویوں کی جرح اور تعدیل میں اس قدر کوشش کی ہے اور اس سے حدیث کی صحت کے متعلق کیا کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں +

روایت کی تنقید مزید احتیاط کے لئے تھی

جاننا چاہئے کہ محض اندرونی شہادت یا قرآن کی شہادت پر کوئی جرح وارد نہ ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ حدیث واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی ہے۔ کیونکہ بہتیری احادیث ایسی وضع ہوسکتی تھیں اور ہوئیں جن کا مفہوم مخالف عقل نہ تھا۔ مگر محض اس وجہ سے کہ ایک بات مخالف عقل نہیں یہ سند نہیں ملتی کہ وہ بات واقعی صحیح بھی ہے اور اس کے راوی نے سچ بیان کیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک جھوٹی بات مخالف عقل نہیں ہوتی بلکہ جن لوگوں کو آجکل عدالتوں میں شہادتوں کے سننے کا اتفاق ہوا ہوگا وہ جانتے ہیں کہ جھوٹی شہادتیں اس قدر احتیاط سے دی جاتی ہیں۔ کہ قرائن اور اندرونی شہادت کی رو سے وہ سچی شہادت سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اور ہزارہا مقدموں کا لائق جج انہیں شہادتوں پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس لئے محدثین نے وہی طریق اختیار کیا جو ہر ایک محقق منتقد کو اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی جب انہوں نے دیکھا کہ ایک حدیث قرائن اور اندرونی شہادت سے وضعی ثابت نہیں ہوتی تو انہوں نے اتنی بات پر اکتفا کرکے اسے سچ نہیں سمجھ لیا اور اپنی کتاب میں داخل نہیں کیا۔ بلکہ پھر پورا زور اس امر کی تحقیق پر لگایا کہ وہ لوگ جن کی روایت سے وہ حدیث ان تک پہنچی ہو کس قسم کے لوگ ہیں۔ آیا وہ ایسے لوگ ہیں جن کی سچائی اور راستبازی اور ان کے حافظہ پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ یا ان کا جھوٹ بولنا یا اکثر غلطی کرنا وغیرہ امور ثابت ہیں جن سے ان کی باتیں بھی قابل اعتبار نہیں رہ جاتیں۔ جن مراحل کو طے کرکے حدیث صحابہؓ سے اس زمانہ کے محدثین تک پہنچی تھی۔ جب کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں ان پر نظر کرکے ضروری تھا۔ کہ جانچیں حدیث راویوں کے معتبر یا غیر معتبر یا معروف یا مجہول الحال ہونے پر پوری بحث کرتے اور بغیر اس بحث کے وہ کبھی صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکتے تھے۔

زمانہ صحابہ کو وضعی احادیث سے پاک ہونے کی وجوہات

میں اس سے پہلے یہ ثابت کرچکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے زمانہ میں وضع حدیث کا کوئی نشان ہمیں نہیں ملتا۔ مگر میور اور سپرنگر محدثین پر اس لئے ناراض ہیں۔ اور بخاری اور مسلم جیسے محققین کو اس لئے ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں۔ کہ انہوں نے صحابہؓ کو جھوٹی احادیث بنانے سے بری کیوں سمجھا ہے۔ اور اصل میں یہی خار ان کے دل میں چبھتا ہے جس کی وجہ سے وہ بار بار اندرونی شہادت اور قرائن کی شہادت کو پیش کرتے ہیں۔ مگر محدثین کیونکر تاریخ کے خلاف ایک امر کو صحیح سمجھ سکتے تھے کیونکہ یہ امر واقع ہے۔ کہ تابعین سے لے کر جس قدر نسلیں ان محدثین کے زمانہ تک گزریں ان میں سے ہر ایک نے پورے یقین سے اس بات کو سمجھا ہوا تھا۔ کہ کسی صحابی نے کوئی حدیث وضع نہیں کی۔ اور حدیث کے پہنچانے میں صحابہؓ کی صداقت پر کبھی کسی قسم کا الزام

عائد نہیں ہو سکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سخت وعید کا کہ جو شخص جھوٹی حدیث بیان کرے گا۔ وہ دوزخی ہوگا۔ اس قدر اثر صحابہؓ کے دلوں پر تھا کہ ان کو جب تک کسی حدیث کے متعلق یقین کامل نہ ہوتا۔ اسے بیان نہ کرتے تھے۔ جمع حدیث کا کام ایک بہت ابتدائی زمانہ میں شروع ہوگیا تھا۔ اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ اگر صحابہؓ میں سے کسی شخص نے حدیث وضع کی ہوتی تو کوئی تذکرہ اس کا نہ پایا جاتا۔ اور ضرور تھا۔ کہ بعض صحابی ہی اس کا ذکر کرتے کہ فلاں حدیث فلاں صحابی نے وضع کی ہے۔ اس لئے اس سے حدیث نہیں لینی چاہیئے۔ صحابہؓ کے درمیان جرائم کا کبھی اخفا نہیں ہوتا تھا۔ اور خواہ کوئی صحابی کسی بڑے گناہ کا مرتکب ہو۔ یا چھوٹے گناہ پر حد قائم کی جاتی تھی۔ اور کبھی کسی شخص کو جرم کی معافی اس وجہ سے نہیں دی گئی کہ وہ صحابیؓ ہے۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ کہ وضع حدیث کا جرم جس کے مجرم کو کذاب اور جہنمی کہا گیا ہے اور جو سب جرموں سے بڑا جرم ہے۔ کیونکہ اس سے دین میں فتنہ پڑتا ہے ایسے جرم کا اخفا کیا جاتا اور اس کے خطرہ سے مسلمانوں کو آگاہ نہ کیا جاتا کیا صحابہؓ اس خطرہ سے آگاہ نہ تھے۔ کہ دین اسلام وضعی احادیث کے مروج ہو جانے سے تباہ ہو جائے گا پھر کیوں کر ممکن تھا۔ کہ حدیث پر حدیث ان کے سامنے وضع کی جاتی اور وہ نہ صرف ایسے مجرموں کو بے سزا چھوڑتے اور ان کے جرم کا اخفا کرتے۔ بلکہ ان کے اس جھوٹ کو اور بھی پھیلاتے۔ پس یہ کسی صورت میں قرین قیاس نہیں کہ اگر وضع حدیث صحابہ رضی اللہ کے زمانہ میں شروع ہو گیا ہوتا تو کوئی صحابی اس بات کا ذکر نہ کرتا۔ نہ ہی وہ سازش کر کے ایسا کام کر سکتے تھے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی صحابہؓ دور دور پھیل گئے تھے۔ اور پھر آپ کی وفات کے بعد فتوحات کا سلسلہ اس قدر وسیع ہوگیا۔ کہ دور دور ملکوں میں اسلامی جھنڈا گاڑا گیا۔ ان سب کا اس امر پر سازش کر لینا کہ وضعی حدیثیں بنائی جا کر شہر کی جائیں اور کوئی شخص بھی نام نہ لے اور آئندہ نسل کو آگاہ نہ کرے کہ یہ حدیثیں وضعی ہیں محال امر ہے ہاں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت مسیحؑ کی طرح ایک یا دو حواری پیچھے رہ جاتے۔ اور وہ سب ایک جگہ ہی جمع ہوتے تو ایسی سازش کا کر لینا بھی ممکن تھا کہ فلاں فلاں سچے واقعات کا اخفا کر دیا جائے۔ اور جھوٹے واقعات ان کی بجائے مشتہر کئے جائیں۔ مگر آنحضرتؐ کے صحابہؓ تو ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھے اور آپ کی زندگی میں ہی تمام عرب میں پھیل چکے تھے۔ پس یہ بالکل محال ہے۔ کہ وہ سازش کر کے وضعی احادیث اور جھوٹے قصوں کا اخفا کرتے۔ ان کے درمیان بعض فروعی مسائل میں

اختلاف بھی تھا۔ مگر کبھی کسی صحابی نے دوسرے صحابی پر وضع حدیث کا الزام نہیں لگایا۔ بلکہ ۳۵ھ میں ہی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پچیس سال بعد ملکی تنازعات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ مگر ان تنازعات میں بھی کبھی کسی فریق نے مخالف فریق پر وضع حدیث کا الزام نہیں دیا۔

علم جرح اور تعدیل کی بنیاد ابتدا سے رکھی گئی۔

علاوہ ازیں علم جرح (گواہ کو بے اعتبار ثابت کرنا) اور تعدیل (اس کو صادق اور قابل اعتبار ثابت کرنا) جو علم حدیث کی ایک نہایت ضروری فرع ہے۔ اس کی بنیاد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پڑ چکی تھی۔ اور خود آنحضرت نے یہ اجازت دی تھی کہ شہادت کے پرکھنے کے لئے گواہ کے چال چلن کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ اور قرآن کریم بھی فرماتا ہے۔ کہ ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا۔ یہ تو صحابہؓ کے زمانہ کا حال تھا۔ اور جب تابعین کے زمانہ کو دیکھتے ہیں تو اس زمانہ میں ہر راوی کے متعلق جرح اور تعدیل کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ اور اسی زمانہ میں مشہور محدث اور امام حدیث یحیٰی بن سعید بن قطان اور شعبہ بن حجاج نے اس علم کے متعلق تحقیقات کر کے واقعات کو جمع کیا۔ اس تحقیقات میں جو رجال حدیث کے متعلق کی جاتی تھی کسی شخص کو باہر نہ چھوڑا جاتا تھا۔ بلکہ ہر ایک کی صداقت اور اس کے چال چلن اور اس کی قوت ضبط وغیرہ کو زیر بحث لایا جاتا تھا۔ اور یہ کسی صورت میں ممکن نہیں۔ کہ اگر تابعین کو یا ان کے بعد آنے والی نسلوں کو ایک صحابی کے متعلق بھی کسی حدیث کا وضع کرنا ثابت ہو جاتا۔ تو وہ صحابہؓ پر دوسری جمع نکرتے جو دوسروں پر انہوں نے کی۔ مگر اصل بات یہ ہے۔ کہ خود صحابہؓ کو اور پھر ان سے بعد ہر ایک نسل کو یہ یقین کامل تھا۔ کہ کسی صحابی نے عمداً کوئی جھوٹی حدیث بنا کر مشہور نہیں کی اور اسی لئے تمام محققین کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ صحابی پر جرح کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جب ایک حدیث ایک مشہور صحابی تک راویوں کے معتبر سلسلہ سے پہنچ جائے۔ تو پھر اسے صحیح اور قابل اعتبار مان لیا جائے۔ اگر یہ خصوصیت صحابیوںؓ کو نہ ہوتی کہ ان میں کسی نے کوئی حدیث جھوٹی نہیں بنائی تو محدثین ان کو بھی علم الجرح والتعدیل کے نیچے اسی طرح لاتے جس طرح وہ تمام دوسرے راویان حدیث کو لائے۔

کن حالات میں روایت کو قبول نہ کیا جاتا تھا

اس تمام بحث سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی نے کبھی کوئی حدیث وضع نہیں کی پس محدثین صرف انہیں حدیثوں کو لیتے تھے جن کی روایت معتبر راویوں کے ذریعہ کسی مشہور صحابی تک

پہنچے۔ اور ان کا سب سے پہلا فرض یہ تھا۔ کہ وہ دیکھیں کہ آیا جن لوگوں نے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ اعتبار کے قابل گواہ ہیں یا نہیں جن مراحل کو طے کر کے علم حدیث دوسری صدی ہجری کے آخر پہنچ گیا تھا۔ ان سے یہ تحقیقات آسان ہو گئی تھی۔ کیونکہ ہر ایک مرحلہ پر جو ائمہ حدیث حدیث کو لیتے اور پھر اسے آگے پہنچاتے تھے۔ وہ پچھلے راویوں کو جرح و تعدیل کے ماتحت لانے کے بعد اور اس بات کو سمجھ کر کہ واقعی یہ حدیث قابل اعتبار ہے۔ اسے قبول کرتے اور آگے پہنچاتے تھے۔ علاوہ ازیں ابتدائی زمانہ تابعین میں ائمہ حدیث جو حدیث کے محافظ اور رکھوالے تھے۔ تھوڑے اور مشہور آدمی تھے۔ اور ان کے حالات صدق اور حفظ وغیرہ کے متعلق بھی مشہور تھے۔ کیونکہ وہ پہلے زیر تنقید آ چکے تھے۔ اس لئے محدثین نے جب دوسری صدی ہجری کے اخیر پر حدیث کو کتابوں میں لکھنا شروع کیا۔ تو انہوں نے سب سے پہلی یہ احتیاط کی کہ جس راوی کے حالات معلوم نہیں اس کی حدیث کو قبول نہ کیا جاوے۔ کیونکہ اس کے صدق پر یا حافظہ پر کوئی جرح نہ ہو سکتی تھی۔ ایسے ہی اور بھی کئی ایک قواعد اس علم کے انہوں نے مقرر کئے جن سے راوی کے اعتبار کا اندازہ کیا جاتا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کوئی حدیث عمداً وضع کی ہے۔ تو ایسے شخص کی روایت کو بالکل ناقابل اعتبار مانا جاتا۔ ایسا ہی اگر کسی راوی کے متعلق معلوم ہو کہ وہ حدیث کی روایت میں اکثر غلطی کرتا ہے تو ضبط اور حافظہ ناقابل اعتبار مانے جاتے راوی کی صداقت اور اس کی رہستبازی کو خصوصاً بہت باریک نظر سے تحقیق کیا جاتا ایسا ہی یہ بھی دیکھا جاتا کہ آیا ایک شخص جو روایت کرتا ہے اس کا اس شخص سے جس سے وہ روایت کرتا ہے ملنا بھی ممکن تھا یا نہیں۔ بلکہ جن محدثین نے اس سے بھی زیادہ احتیاط کی ہے۔ انہوں نے یہ ضروری سمجھا ہے۔ کہ واقعی ایک کے دوسرے سے ملنے کا ثبوت ہونا چاہئے۔ اور بغیر اس کے حدیث قبول نہیں کی جائیگی۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی تحقیقات میں اس بات کو ضروری سمجھا ہے۔ ایسا ہی راوی کے حافظہ وغیرہ کے متعلق شہادت لی جاتی۔ ان اصول اور قواعد کے رو سے راوی اور اس کی روایت کو معتبر یا غیر معتبر قرار دیا جاتا تھا۔ اور ہر ایک شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ کہ تحقیق و تنقید کا پہلو جو محدثین نے اختیار کیا کس قدر مشکل ہے۔ مگر سچ یہی ہے۔ کہ خواہ میور صاحب یا کسی اور پادری صاحب کو اس کی سمجھ آئے یا نہ آئے اس کے بغیر کبھی کسی حدیث کو معتبر یا غیر معتبر قرار نہ دیا جا سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ سارے سامان جن کے ذریعے یہ عظیم الشان تحقیق اور تنقید کا کام تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔ پہلے سے موجود تھے۔ کیونکہ جمع حدیث کے ہر مرحلہ پر انہی تمام اصول اور قواعد سے کام لیا گیا تھا اور جس طرح علم حدیث ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا۔

اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم تنقیدی بھی پہنچتے رہے۔ صحابہؓ اور تابعین کے زمانہ میں ائمہ حدیث کی تعداد ایسی زیادہ نہ تھی اور ان کے حالات بھی مشہور و معروف تھے۔ البتہ بعد کے زمانہ میں حدیث کے راویوں اور حدیث کے علم کو پھیلانے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی پس جس قدر ان سب لوگوں کے حالات کا معلوم کرنا مشکل تھا۔ اسی قدر قرب زمانہ کے سبب سے اس میں آسانی بھی ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں ہر زمانہ کے محدثین نے بجائے خود احادیث کو پوری تنقید اور تحقیق کے بعد قبول کیا۔ اور پھر اپنے شاگردوں کو حدیث سکھانے کے علاوہ تنقیدی علوم بھی سکھائے۔ پس حدیث کے ساتھ ساتھ ہی ہر مرحلہ پر تنقیدی علوم متعلقہ حدیث بھی جمع ہوتے چلے گئے۔ اور میں یہ پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ تابعین کے زمانہ میں بھی علم جرح و تعدیل کے امام پائے جاتے تھے۔ جنہوں نے اس علم کے متعلق واقعات کو تحقیق اور جمع کیا۔ پس اگرچہ ان محدثین کی راہ میں جنہوں نے تیسری صدی ہجری کے شروع میں حدیث کو کتابوں میں لکھنا شروع کیا بہت سی مشکلات تھیں۔ مگر یہ مشکلات ایسی نہ تھیں جن کا حل کرنا محالات سے ہوتا۔ بلکہ ان کے حل کرنے کے سامان بھی ساتھ ہی موجود تھے +

محدثین نے ایک دوسرے سے آزادانہ کر تنقید کی

ایک اور اعتراض جو میور نے کیا ہے۔ یہ ہے کہ محدثین کو ایک دوسرے کی تحقیق پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ کیونکہ ہر ایک محدث نے اپنے اپنے طریق سے تخریج احادیث کی ہے۔ گویا اپنے سے پہلے محدث کی تحقیق کو اس نے درست نہیں سمجھا عجیب نمایدہنرش در نظر والا معاملہ ہے۔ ان لوگوں نے اسلام پر اعتراض کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے اور نہیں سوچتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جہاں تک ہم دیکھتے ہیں۔ ہر محدث کی آزادانہ تحقیقات صحت احادیث پر ایک کھلا کھلا گواہ ہے۔ مگر پادری صاحبان کے نزدیک یہی اعتراض ہے اگر محدثین آزادانہ تحقیقات الگ نہ کرتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ ایک شخص نے جو حدیثیں جمع کر دیں سب نے اسی کا تتبع کیا۔ اس لئے یہ احادیث قابل اعتبار ہی نہیں۔ کیونکہ صرف ایک شخص کی رائے کی پیروی سب نے کی ہے۔ اور اس سے پادری صاحبان کو یہ کہنے کا موقع بھی ملتا کہ اسلام میں آزادانہ تحقیقات کی روح ہی نہیں ہے۔ لیکن جب ایسی تحقیق کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ الگ الگ راہوں پر چل کر کل محدثین ایک ہی نتیجہ پر پہنچے۔ تو اب پادری صاحبان کہتے ہیں کہ محدثین کو ایک دوسرے کی صداقت کا اعتبار نہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ محدثین کے اس طریق سے ہمیں صحت حدیث پر بڑی بھاری دلیل ملتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ اختلاف باہمی اعلیٰ طبقہ کے محدثین

میں ہیں وہ بمقابلہ متفقہ احادیث کے کچھ بھی نہیں۔ پس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی یہ احادیث کے مجموعے قابل اعتبار ہیں۔ اور کم از کم یہ کہ جن احادیث پر دو دو تین تین چار چار محدثین کا اتفاق ہوگیا ہے۔ ان کی صحت میں عموماً کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ مختلف زمانوں میں مختلف ملک میں مختلف آدمیوں کا اپنے اپنے طور پر تحقیقات کرکے سب کا ایک ہی بات پر متفق ہوجانا اس بات کی صحت پر ایک بڑی بھاری شہادت ہے۔ مثلاً جو کتابیں دوسری صدی ہجری کے نصف میں لکھی گئیں۔ اور جو تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں وہ بھی ایک دوسرے کی تائید ہی کرتی ہیں اور سوائے اس کے کہ پچھلی کتابیں جامع ہیں۔ اور کوئی اختلاف ایسا نظر نہیں آتا جس سے احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر کوئی شبہ پڑسکے۔ بلکہ تمام بڑی بڑی باتوں اور اہم امور میں ان سب کا اتفاق ہے +

حدیث میں اختلافات

اب جب ہم اختلافات پر غور کرتے ہیں۔ تو ان میں کوئی ایسی بات نہیں پاتے جس سے حدیث کی صحت پر شبہ وارد ہوسکے بلکہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اختلاف ہوتے اور ان اختلافوں کا ہونا دراصل احادیث کی صحت پر ہی شہادت ہے۔ مثلاً اول تو فروع میں مذہب اسلام نے ایسی سختی نہیں کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی اختلافات فروع میں پائے جاتے ہیں جس کی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض فعلوں کو کئی طرح کرکے دکھایا۔ یا بعض امور میں خود ہی رخصت دی اس کی شہادت کثرت سے احادیث سے ملتی ہے۔ بلکہ جب امام مالکؒ موطا لکھ چکے تو خلیفہ ہارون الرشید نے آپ سے یہ مشورہ کیا کہ موطا کو کعبہ میں لٹکا دیا جاوے۔ اور لوگوں کو یہ حکم دیا جاوے کہ وہ سب اسی پر عمل کریں۔ جو موطا میں لکھا گیا ہے۔ تو امام مالکؒ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ فروع میں تو صحابہؓ میں بھی اختلاف تھا۔ اور وہ دور دور ملکوں میں پھیل چکے تھے جس سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اختلاف جائز ہیں۔ اور ان اختلافوں کے ہونے سے کسی حدیث کی صحت پر شک نہیں پڑسکتا۔ ایسا ہی جب خلیفہ منصور نے امام مالکؒ سے کہا کہ موطا کے نسخے سب شہروں میں بھیج دیئے جاویں۔ اور کل لوگوں کو تاکید کی جاوے کہ وہ اس پر عمل کریں۔ تو یہی جواب اس وقت بھی آپ نے دیا۔ دوسرے قسم کے فرق وہ ہیں جو اس وجہ سے اختلاف معلوم ہوتے ہیں۔ کہ یا تو مثلاً دو تصنیفوں کا دائرہ ایک سا ہی وسیع نہیں۔ مثال کے طور پر موطا اور صحیح بخاری کو لو صحت کے لحاظ سے یہ دونوں سب سے اعلیٰ طبقہ حدیث کی کتابیں ہیں۔ مگر موطا میں صرف

تین سو کے قریب حدیثیں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں اڑھائی ہزار سے کچھ اوپر ہیں۔ اب اس فرق کی وجہ یہ ہے۔ کہ امام مالکؒ نے صرف اہل حجاز کی حدیثیں لیں لیکن امام بخاری نے بلاد و امصار میں پھر کر ہر جگہ سے حدیثیں جمع کیں۔ اور اسی طرح امام مالکؒ نے ہر قسم کی حدیثیں جمع نہیں کیں اور امام بخاریؒ نے ہر قسم کی حدیثیں جمع کیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور ابوداؤد کی حدیثوں میں بھی ایک قسم کا فرق پایا جاتا ہے جس کی وجہ وہ قوانین تنقید ہیں۔ جو ہر ایک نے الگ الگ اختیار کئے۔ مثلاً مسلم کے نزدیک یہ کافی ہے کہ جو راوی حدیث بیان کرتا ہے۔ اس کے متعلق یہ ثابت ہو کہ جس سے وہ حدیث بیان کرتا ہے یعنی اس کا شیخ وہ اس کا ہمعصر ہے۔ مگر بخاریؒ کے نزدیک اس قدر پر اکتفا کرنا ٹھیک نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے جس قانون تنقید کی رو سے حدیثوں کو قبول کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ راوی کا اپنے شیخ سے ملاقات کرنا ثابت ہو۔ اس طرح پر بخاری کے قوانین تنقید دوسرے تمام محدثین کی نسبت سخت تر تھے۔ اور ان کی پابندی سے حدیث کو جمع کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر چونکہ جس طریق پر امام بخاریؒ حدیثوں کو پرکھتے تھے۔ وہ بہت محتاط طریق تھا۔ اس لئے بخاری کی حدیثیں بھی صحت کی رو سے افضل ہیں۔ اگرچہ تعداد میں کم ہیں۔ مثلاً وہ حدیث جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کا نقش تین سطروں میں تھا۔ محمدؐ ایک سطر میں رسول ایک سطر میں اور اللہ ایک سطر میں۔ یہ حدیث صرف بخاری میں پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے کبار محدثین نے اسے نہیں لیا مگر اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کے دریافت ہونے سے اس حدیث کی صحت ثابت ہو گئی۔ اس طرح پر بخاری کی احادیث کی صحت دوسری تمام کتابوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور جو عام اعتقاد امت محمدیہ کا اس کتاب کے متعلق ہے کہ یہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ وہ بالکل درست ہے۔ ایسا ہی صحیح مسلم۔ ابوداؤد اور ترمذی نسائی وغیرہ سے فضیلت رکھتی ہے۔ کیونکہ جہاں بخاری اور مسلم صرف ان احادیث کی تخریج کرتے ہیں جن کے راویوں کے قابل اعتبار ہونے پر پہلے محدثین کا اتفاق رہا ہو۔ نسائی نے ان حدیثوں کو بھی لے لیا ہے جن کے راویوں کے قابل اعتبار ہونے پر اگرچہ اتفاق نہیں مگر ان کے قابل اعتبار ہونے پر بھی اتفاق نہیں یعنی کسی نے ان راویوں کو ثقہ مانا ہے اور کسی نے غیر ثقہ ایسا ہی ابوداؤد نے ان ابواب میں جہاں سے اعلیٰ طبقہ کی صحیح احادیث نہیں ملیں ضعیف حدیثوں کو لے لیا ہے پس ان مختلف قواعد تنقید کی پیروی سے یہ ضروری تھا۔ کہ بعض

حدیثیں جو ایک محدث نے قبول کرلی ہیں۔ دوسرا انہیں قبول نہ کرتا۔ اب ان اختلافات کو چھوڑ کر جن کا ذکر اوپر ہوا یعنی وہ اختلافات جو فروعی مسائل میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کا ہونا صحابہؓ میں بھی ثابت ہے یا وہ فرق جو بسبب تنگی یا وسعت دائرہ تحقیق کے پیدا ہوئے اور وہ فرق جو بسبب قواعد تنقید میں سختی یا نرمی کے پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کو جو کہ دراصل حدیث کی صحت پر ان سے کوئی شبہ وارد نہیں ہوتا۔ الگ رکھ کر باقی جو اختلاف رہ جاتے ہیں وہ برائے نام اختلاف ہیں۔ اور اس طرح پر مختلف محدثین کی اپنی اپنی آزادانہ تحقیقات کا نتیجہ احادیث کا ایک عظیم الشان مجموعہ ہے جس کی صحت میں ایک محقق کو کسی قسم کا شک نہیں ہو سکتا۔

محدثین کا شاہان وقت کے اثر کے ماتحت نہ ہونا

ایک اور اعتراض تنقید حدیث کے متعلق جو پادری صاحبان کرتے ہیں یہ ہے کہ محدثین نے طرح طرح کے اثروں سے موثر ہو کر احادیث کو جمع کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر ان بادشاہوں کے اثر سے جن کی حکومت میں جمع حدیث کا کام ہوا۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا۔ کہ کسی خوشامدی نے کسی بادشاہ کے خوش کرنے کے لئے حدیثیں وضع کی ہوں۔ مگر یہ کہنا کہ بخاری اور مسلم جیسے محدثین نے احادیث کو جمع کرتے وقت بادشاہ وقت کا لحاظ کیا۔ اور مضبوط اور صحیح احادیث کو جو بادشاہ کے فوائد کے منافی تھیں۔ رد کر دیا۔ یا کمزور احادیث کو جن سے اس کے فوائد کی تائید ہوتی تھی قبول کر لیا۔ ان راستباز محققین پر سراسر افترا ہے جن محققین نے احادیث کو جمع کیا۔ ان کو قطعاً حکومت کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اور نہ حکومت کے اثر کے ایسے نیچے تھے۔ کہ ایسا بے ایمانی کا کام کرتے۔ نہ وہ بادشاہوں کے درباروں میں جانے والے تھے۔ اور نہ ان کو یہ خیال تھا کہ ہمارے کسی منصب یا عزت میں فرق آ جائے گا۔ وہ صرف اسی عزت کے خواہاں تھے۔ جو خدا کے ہاں سے سچے متقی کو ملتی ہے۔ جب بخارا کے حاکم نے امام بخاری علیہ الرحمۃ سے یہ درخواست کی۔ کہ آپ اس کے لڑکوں کو شاہی محل میں آکر پڑھایا کریں تو آپ نے جواب دیا۔ کہ میں علم فروشی نہیں کرتا۔ پھر جب اس نے کہا کہ آپ اپنے مکان پر ہی پڑھائیں لیکن دوسرے لوگوں سے الگ کر کے پڑھائیں تو آپ نے یہ بھی نامنظور کیا۔ اور فرمایا کہ اگر آپ ان کو پڑھانا چاہتے ہیں تو جہاں عام لوگ بیٹھتے ہیں وہیں یہ بھی آ جایا کریں چنانچہ آپ نے جلاوطنی قبول کی مگر اس بات کو قبول نہ کیا۔ کہ علم کو شاہی اثر کے نیچے آنے دیں یا بادشاہی کو علم کے مقابلہ پر کوئی عزت دیں۔ ایسا ہی اور بھی مثالیں موجود ہیں جن سے

ثابت ہوتا ہے۔ کہ محدثین کو بادشاہوں کی ہرگز پرواہ نہ تھی۔ اور حدیث کے جمع کرنے میں وہ
صرف انہیں قواعد تنقید کے پابند تھے۔ جن کو انہوں نے ضروری سمجھا۔ بلکہ ایک مشہور شاہی
قاضی کے متعلق جب انہیں معلوم ہوا۔ کہ اس نے بادشاہ کے خوش کرنے کیلئے ایک حدیث میں
ایک لفظ بڑھا دیا ہے۔ تو اس کی حدیث کو انہوں نے مطلقاً چھوڑ دیا۔

غلطی کا امکان

باوجودیکہ میور محدثین کے اصول تنقید کو بالکل بے حقیقت ظاہر کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ
اس بات کا اعتراف کرتا ہے۔ کہ وہ اس قدر سخت تھے کہ ایک سو میں سے ننانوے حدیثوں کو
انہی قواعد کی رو سے وہ قبول نہیں کر سکے۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں۔ کہ اگر ان اصول کی رو سے
جن پر پادری صاحبان کے نزدیک اصول تنقید کا نام چسپاں نہیں ہو سکتا صرف سو میں سے
ایک حدیث قبول کی گئی۔ تو پھر ان کے فرضی اصول تنقید کی رو سے تو لاکھ میں سے ایک
حدیث بھی قابل اعتبار نہیں ہونی چاہئے۔ دوسری طرف یہ تعجب آتا ہے۔ کہ ان کے یہ خیالی
قواعد تنقید جن کے بغیر یورپین دل اور دماغ خوش نہیں ہو سکتا اس وقت کہاں رکھے
جاتے ہیں۔ جب اناجیل کے بے سروپا قصوں کو وہ صحیح تاریخ سے بھی بڑھ کر کچھ رتبہ دیتے ہیں
حالانکہ ایشیائی قواعد تنقید سے پرکھا جانے پر بھی وہ اس طرح پاش پاش ہو جاتے ہیں جس طرح
نور کے سامنے ظلمت۔ مگر احادیث کے متعلق میور کو خود اقرار ہے کہ "دوسری صدی ہجری میں
حدیث میں اکثر حصہ صداقت کا پایا جاتا ہے" تو پھر اگر وہ اکثر حصہ صداقت کا محدثین کی جمع
کردہ احادیث میں نہیں تو کیا ان احادیث میں ہی جن کو محدثین نے ناقابل اعتبار سمجھ کر رد
کر دیا ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مخالف خواہ کیسا ہی مخالفت پر تلا ہوا ہو۔ اس قدر حماقت کا دعویٰ
کرے گا۔ محدثین نے تاریخی طور پر احادیث کی صداقت کو ثابت کیا ہے۔ ان سے غلطی کا ہو جانا
بھی ممکن ہے۔ مگر اتنی بات سے وہ تاریخ کی حیثیت سے گر نہیں سکتیں کیونکہ کسی تاریخ کے متعلق
خواہ وہ ان واقعات کے زمانے میں ہی لکھی گئی ہو۔ جب ان کا ظہور ہو مگر تاہم یہ نہیں کہہ سکتے
کہ وہ غلطی کی آمیزش سے بالکل پاک ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ ایک حدیث جسے کسی محدث نے
ناقابل اعتبار سمجھ کر رد کر دیا ہو۔ در اصل صحیح ہو۔ مگر اس کی صحت کا ثبوت اور طرح سے ملنا چاہیے
ایسے امکانوں کی بنا پر کوئی سمجھدار آدمی یہ طریق اختیار نہیں کیا کرتا کہ ہر ایک معتبر اور مستند
واقعہ کو فرضی سمجھ لے اور جھوٹے مضمون کو صحیح سمجھ لے۔ بلکہ جہاں اس قدر تحقیق سے ایک کام
کیا گیا ہے۔ اس میں اگر کوئی غلطی ہے تو اس کے لئے دلائل پیش کرنے چاہئیں۔ اور اگر کوئی

صحیح امراس سے باہر چھوڑ دیا گیا ہے۔ تو اس کی صحت کا ثبوت دینا چاہئے۔ محدثین نے ہر طرح سے اور پوری پوری نیک نیتی سے اپنی تحقیقات کی ہے۔ اور جن نتائج پر وہ پہنچے ہیں۔ ان کو آج ہم یہ بات کہہ کر رد نہیں کر سکتے کہ ممکن ہے انہوں نے کوئی غلطی کی ہو +

بخاری کی فضیلت تمام حدیث کے مجموعوں میں امام بخاری علیہ الرحمۃ کی کتاب فوقیت رکھتی ہے یہاں تک کہ کل اُمت محمدیہ کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے۔ کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے بھی یہ کتاب جمع حدیث کی تکمیل کو پہنچانے میں سب پر مقدم ہے۔ اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بھی سب پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس کو یہ عزت اور شہرت بعد کے زمانے ہی میں حاصل نہیں ہوئی بلکہ امام بخاری کے تمام معاصر آپ اور آپ کی اس تصنیف کی فضیلت کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی۔ کہ آپ نے احادیث کے لینے میں بہت ہی احتیاط کی تھی۔ مثلاً صحت حدیث کیلئے عام شرط تو صرف اسی قدر تھی۔ کہ راوی مسلم ہو صادق ہو مدلس (یعنی ایک روایت کو دوسرے کر دوسرے کی بیان کرنے والا) نہ ہو مختلط نہ ہو۔ صفات عدالت سے متصف ہو۔ ضابط اور متحفظ ہو سلیم الذہن ہو قلیل الوہم ہو سلیم الاعتقاد ہو لیکن ان سب احتیاطوں کے علاوہ امام بخاریؒ اور بھی کئی طرح کی احتیاطوں سے کام لیتے تھے۔ اگر ایک محدث مثلاً زہری کے شاگردوں کو پانچ طبقوں پر تقسیم کیا جائے۔ تو وہ عموماً صرف سب سے اعلےٰ طبقہ کی روایت کو لیتے یعنی وہ طبقہ شاگردوں کا جس کے متعلق یہ ثابت ہو کہ یہ زہری کی صحبت میں اکثر رہے ہیں۔ اور سفر و حضر میں انہوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جیسے یونس بن یزید۔ عقیل بن خالد مالک بن انس۔ سفیان بن عیینہ۔ شعیب ابن ابی حمزہ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے راویوں میں غلطی کا احتمال بہت ہی کم رہ جاتا تھا۔ کیونکہ اکثر ساتھ رہنے سے بار بار احادیث کو وہ سنتے تھے اب اگرچہ زہری کے راویوں کا دوسرا طبقہ بھی بلحاظ حفظ و اتقان وغیرہ کے قابل اعتماد ہے۔ لیکن یہ خصوصیت جو طبقہ اول کو حاصل تھی دوسرے طبقہ کو حاصل نہ تھی اس لئے امام بخاریؒ نے طبقہ اول کی ہی روایت لی ہے۔ جو سب سے معتبر طبقہ تھا۔ ایسا ہی امام بخاریؒ نے دوسرے محدثین کی طرح صرف اس قدر ثبوت پر اکتفا نہیں کیا۔ کہ راوی اپنے شیخ کا ہمعصر ہو۔ بلکہ جب تک راوی کی اپنے شیخ سے ملاقات کا ثبوت نہ ملے۔ اس وقت تک وہ اس کی حدیث کو قبول نہ کرتے تھے +

امام بخاریؒ کے اصول تنقید کی سختی امام بخاری علیہ الرحمۃ کے قواعد تنقید اس قدر سخت تھے۔ کہ وہ خود

کہتے ہیں۔ کہ میں نے ایک شخص کی دس ہزار حدیثوں کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ مجھے اس کی صداقت پر شبہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ پادری صاحبان مسلمان محدثین کے اصول تنقید پر اپنا اطمینان ظاہر نہیں کرتے۔ مگر یقینی امر ہے۔ کہ اگر کبھی بخاری جیسا ایک انسان عیسائی مذہب میں پیدا ہوتا۔ تو پولوس جیسے آدمی کی شہادت کو وہ ہرگز قبول نہ کرتا۔ کیونکہ پولوس وہ شخص ہے جس نے

عیسائی بزرگوں کا دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو جائز رکھنا

صریح طور پر عیسائی مذہب کے پھیلانے کے لئے جھوٹ کا بولنا جائز رکھا۔ جیسا کہ وہ رومیوں ۳ باب ۷ آیت میں لکھتا ہے۔ "پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کے لئے زیادہ ظاہر ہوئی تو مجھ پر کیوں گنہگار کی طرح حکم ہوتا ہے"۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر عیسائیوں کے درمیان ایک انسان بھی ایسا منقد اور محتاط نہیں تو ایسا دیانتدار ہی ہوتا جیسا اسلام کے یہ عظیم الشان محدثین تھے تو حضرت مسیح کا مذہب کچھ نہ کچھ ضرور اپنی اصلیت پر رہ جاتا۔ مگر افسوس کہ ان لوگوں نے مسیح کو خدا بنانے کے لئے طرح طرح کے جھوٹ سے کام لیا۔ اور ان کے بڑے بڑے اسقف یہ اصل اپنے مدنظر رکھتے تھے جس کو یوسیبس ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کہ "میں نے وہ تمام باتیں بیان کر دی ہیں جن سے ہمارے مذہب کا جلال ظاہر ہو۔ اور ان تمام باتوں کو دبا دیا ہے۔ جن سے ہمارے مذہب کو کسی طرح سے ذد پڑتی تھی" پس ایسے ایسے حامیان دین کے ہوتے ہوئے۔ جو کھلے طور پر اپنے اصول کو ان الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ ہم یقین کر سکتے ہیں۔ کہ عیسائی مذہب کی جو تحریریں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ ان میں بہ نسبت سچائی کے جھوٹ زیادہ ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایسے آدمی ہوئے جنہوں نے جھوٹی احادیث بنا کر مشہور کیں۔ مگر مسلمان علماء اور محدثین نے ان کے جھوٹ کو دین میں ملنے نہیں دیا اور ان جھوٹوں سے جن کے بنانے والے اکثر یا تو خود غرض تھے یا زندیق لوگ جو مذہب اسلام کو ان جھوٹوں سے بیخ و بنیاد کرنا چاہتے تھے اہل اسلام نے اس وقت سے لیکر آج تک ہمیشہ بیزاری ظاہر کی ہے اور انکے ناپاک جھوٹوں سے لوگوں کو بچانے کے لئے فی الفور کتابیں تصنیف کیں۔ مگر مذہب کی ترقی کی خاطر جھوٹ بولنا جس کا پولوس اور اس کے بڑے بڑے جانشین اسقف فخریہ اقرار کرتے ہیں اسلام ایسی ناپاکی سے ہمیشہ پاک رہا ہے۔ کیونکہ اس کے بانی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پہلے سے ہی اپنی اُمت کو متنبہ کر دیا تھا۔ کہ جو شخص میرے نام سے جھوٹ بنائے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ پس اسلام میں مذہب کی خاطر جھوٹ بنانا ایک سخت ناپاک جرم تھا۔ مگر عیسائیت نے اس پر فخر کیا ہے۔ پھر جن لوگوں کے گھر میں یہ حالت ہو۔ ان کو اسلام کے

محقق محدثین پر اعتراض کرتے ہوئے شرم کرنی چاہیئے ۔

امام بخاری کے ننانوے حدیثوں میں سے ایک کو لینے کے معنی

یہاں میں اس بات کا جواب دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ امام بخاری نے جو چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف چند ہزار میں یعنی قریباً سات ہزار اور اس طرح گویا سو حدیث میں سے ایک کو لیا اور ننانوے کو ترک کر دیا تو اس کے کیا معنی ہیں کیا فی الواقع اس وقت موضوع احادیث کی اس قدر کثرت تھی کہ آپ کو سو میں سے ننانوے ترک کرنی پڑیں۔ اور ان ننانوے کو انہوں نے موضوع سمجھ کر ترک کیا۔ اور آیا فی الواقع وہ سب کی سب نابود ہو گئیں۔ اس سے تو یہ وہم پیدا ہوگا کہ واقعی محدثین کے زمانہ میں احادیث میں جھوٹ اس قدر رل گیا تھا۔ کہ سو میں سے گویا ننانوے حصے جھوٹ تھا۔ یہ وہم بالکل فضول ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کے مرکز بہت تھے جہاں علیحدہ علیحدہ حدیث کا درس ہوتا تھا۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں حدیث کو ایک دوسرے سے روایت کرنے والے تھے پس جب چھ لاکھ حدیث کہا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ فی الواقع اس قدر الگ الگ حدیثیں تھیں۔ ایک ہی حدیث کو جب ایک سلسلہ روایت سے بیان کیا جائے اور پھر اس کے سلسلہ رواۃ میں ایک آدمی کی بجائے دوسرا داخل ہو جائے تو یہ ایک علیحدہ حدیث سمجھی جاتی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب علم حدیث کا چرچا اس قدر تھا تو راویوں کے اختلاف کے لحاظ سے احادیث کی تعداد کا لاکھوں تک پہنچ جانا ایک معمولی امر تھا۔ لاکھوں حدیثوں کے ہونے سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر مختلف راوی اس وقت حدیثوں کے روایت کرنے والے تھے۔ اب ان میں سے بہتیرے لوگ گمنام ہوں گے جن کے حالات کا پورا علم نہیں چلا پس ایسی احادیث یعنی روایات مختلفہ کو محدثین نے ترک کر دیا۔ اسی اصول کے مطابق اب بھی صحیح بخاری میں جو احادیث مکرر آئی ہیں مگر ان کے سلسلہ روایت میں کہیں تبدیلی ہو گئی ہے تو اسکو ایک الگ حدیث گنا جاتا ہے اور اسی وجہ سے صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد سات ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے ورنہ مکررات کو حذف کرنے سے یہ تعداد کم رہ جاتی ہے ۔

صحاح ستہ کے سوا دیگر کتب احادیث میں تنقید میں تساہل

صحاح ستہ کے بعد دوسری کتب حدیث کا مرتبہ ہے۔ ان کے جمع کرنے میں اس قدر قواعد تنقید کی سختی نہیں برتی گئی جیسے کہ صحاح میں اس لیئے ان کتابوں میں ہر قسم کی احادیث شامل ہیں۔ البتہ یہاں بھی یہ احتیاط ضرور

پائی جاتی ہے کہ جن احادیث میں مسائل دین بیان ہوئے ہیں۔ ان کی صحت کے پرکھنے میں زیادہ سختی سے کام لیا گیا ہے۔ اور جن احادیث میں قصص یا دیگر اخبارات یا اور امور ہیں ان میں زیادہ تر تساہل سے کام لیا گیا ہے کیونکہ اس کا کوئی چنداں اثر دین پر نہیں پڑتا۔ چنانچہ بیہقی نے کسی دوسرے کا قول نقل کرتے ہوئے کتاب المدخل میں لکھا ہے اذا روینا عن النبی فی الحلال والحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سہلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال یعنی جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال وحرام اور احکام کے بارہ میں روایت لیتے ہیں تو سند میں سختی سے کام لیتے ہیں اور راویوں کو خوب پرکھ لیتے ہیں اور جب فضائل میں اور ثواب وعقاب کے متعلق روایت کرتے ہیں تو ہم سند میں نرمی سے کام لیتے ہیں اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔ ایسا ہی امام احمد بن حنبل ابن اسحاق کے متعلق لکھتے ہیں ابن اسحاق رجل تکتب عنہ ھذہ الاحادیث یعنی للمغازی ونحوھا واذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما ھکذا وقبض اصابع یدیہ الاربع یعنی ابن اسحاق اس پایہ کے آدمی ہیں کہ یہ یعنی مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جاسکتی ہیں اور جب حلال اور حرام کے مسائل آئیں تو پھر ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں اور یہ کہکر انھوں نے چاروں انگلیاں بند کرکے دکھلیں (ماخوذ از سیرت النبی مصنفہ شبلی)

کیا ہم روایت یا درایت کی رو سے تنقید حدیث نہیں کرسکتے

اس بحث سے یہ ظاہر ہے کہ محدثین نے نہ صرف کامل طور پر تنقید روایت ہی کی ہے بلکہ درایت کی رو سے بھی ایک حد تک تنقید کی ہے گو ان اصول کو جو انھوں نے احادیث موضوع کے پرکھنے کے لئے تجویز کئے بنظر احتیاط زیادہ وسعت نہ دی ہو۔ لیکن ہمارے سامنے اب ایک نہایت ضروری سوال آتا ہے کہ آیا محدثین رحمہم اللہ کی کوششوں نے ہم کو بالکل تنقید احادیث سے مستغنی کردیا ہے۔ یہ دعویٰ ان بزرگوں کا نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ سلسلہ روایت کے ساتھ ہی حدیث کو بیان کرتے ہیں تاکہ آئندہ بھی کوئی اس پر تنقید کرسکے اور جس طرح باوجود محدثین کی ان تھک کوششوں اور کمال سعی کے سلسلہ روایت پر ہم اب بھی تنقید کرسکتے ہیں اسی طرح درایت کی رو سے بھی ہم کسی حدیث کو زیر بحث لاسکتے ہیں۔ اصول درایت جن کو میں نے اوپر شاہ عبدالعزیز صاحب

کے نافعہ عجالہ سے نقل کیا ہے۔ دراصل محدثین کے قائم کردہ ہی ہیں ابن جوزی نے بھی قریب قریب یہی اصول بیان کئے ہیں۔ اور ان تمام احادیث کو موضوع کہا ہے جو عقل یا اصول مسلمہ یا محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہوں۔ ملا علی قاری نے موضوعات میں بھی اسی کے

حدیث موضوع کا پتہ کس طرح لگ سکتا ہے

قریب اصول درایت بیان کئے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ ابن قیم الجوزیہ سے سوال کیا گیا کہ حدیث موضوع کا پتہ سوائے سند کو دیکھنے کے بھی لگ سکتا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ایسا شخص ان کو پہچان سکتا ہے جو سنن صحیحہ سے خوب واقف ہو گویا وہ اس کے گوشت پوست میں داخل ہو چکی ہوں اور معرفت سنن میں اسے خصوصیت حاصل ہو چکی ہو۔ اور نبی کریم صلعم کی سیرت اور آپ کے اخلاق سے وہ پورا واقف ہو۔ اور جانتا ہو کہ آپ کیا حکم دیتے ہیں اور کس بات سے روکتے ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے اسے ایسا شدید تعلق ہو چکا ہو کہ گویا اسے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح آپ سے مخالطت حاصل ہو چکی ہے تو ایسا شخص آپ کے احوال اور اوامر اور نواہی کو خوب پہچان سکتا ہے۔ اور اس کے بعد ان امور کلی کو بیان کیا ہے جن سے حدیث موضوع پہچانی جا سکتی ہے جن میں سے بعض وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ مگر چند خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کہ حدیث ستہ صریح کے خلاف ہو جیسے مثلاً یہ حدیث کہ جس کا نام محمد یا احمد ہو وہ آگ میں داخل نہیں ہوگا۔ کیونکہ آگ سے نجات اعمال پر ہے نہ ناموں پر یا القاب پر۔ یہ اصول دینی کے خلاف ہے +

تنقید حدیث کے پانچ موٹے اصول

پس یہ ایک نہایت محکم اصول ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے کہ جو حدیث اصول دینی کے خلاف ہو وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ ایسا ہی ایک اصول کلی یہ بیان کیا ہے کہ وہ حدیث جو واقعات یا مشاہدہ کے خلاف ہو یعنی فی نفسہ باطل ہو جیسا کہ یہ حدیث کہ دھوپ میں گرم ہوئے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے مرض پیدا ہوتا ہے۔ تیسرا قصوں کی احادیث ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں الاحادیث التی یذکر فیھا الخضر وحیاتہ کلھا کذب ولا یصح فی حیوتہ حدیث واحد یعنی وہ حدیثیں جن میں خضر اور اس کی زندگی کا ذکر ہے سب کی سب جھوٹی ہیں اور اس کی زندگی کے متعلق ایک بھی حدیث صحیح نہیں ایسا ہی عوج بن عنق کے قد کی حدیثیں یہ کہ وہ ۳۳۳۳ گز لمبا تھا۔ یا یہ کہ سمندر میں چلتا ہوا سمندر کی تہ سے مچھلی نکال کر سورج کے سامنے رکھ کر بھون کر کھاتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی خرافات قصوں میں قصہ گو لوگوں نے داخل کر دی ہیں۔ اسی لئے بعض لوگوں نے یہاں تک لکھا ہے

کہ تفسیر کی کتابوں کا کوئی اصول نہیں جیسا کہ مغازی اور ملاحم کا کوئی اصول نہیں۔ کیونکہ سب قسم کے قصے جو مل گئے وہ بغیر تنقید کے لیکر ان میں داخل کر دیئے گئے ہیں چوتھا اصول یہ ہے کہ جو حدیث قرآن شریف کے صریح مخالف ہو۔ جیسے مثلاً وہ احادیث جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف علم غیب منسوب کیا گیا ہو۔ کیونکہ قرآن شریف صاف فرماتا ہے۔ قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ قرائن سے حدیث کا غلط ہونا معلوم ہو۔ جیسے اہل خیبر سے وضع جزیہ کی حدیث جس کا ذکر اوپر گزر چکا +

روایت میں وہ حصہ جس میں قیاس کو دخل دیا گیا ہے

علاوہ ان تمام امور کے میں ایک خاص امر کے ذکر کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ حدیث میں اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اس میں کچھ اقوال یا افعال یا مشاہدات ہوتے ہیں اور کچھ حصہ بعض وقت راوی کے قیاس کا داخل ہو جاتا ہے جس حصہ کی بنیاد قیاس پر ہے اس کو وہی وقعت دینی چاہئے جو ایک صحابی یا دوسرے راوی کے قیاس کو دی جا سکتی ہے۔ بعض صحابہ اپنے اجتہاد میں کمال کو پہنچے ہوئے ہیں بعض اس سے کم مرتبہ پر ہیں سب کا اجتہاد یا قیاس یکساں طور پر قابل قبول نہیں۔ اور بعض وقت جو نتیجہ راوی نے کسی واقعہ سے نکالا ہوتا ہے وہ بالکل قابل قبول نہیں ہوتا۔ مثلاً بعض وقت حضرت ابوہریرہ کی روایات میں اصل بات کا ذکر کر کے آجاتا ہے فاقرؤا ان شئتم فویہ انکا اپنا قیاس ہوتا ہے ایسا ہی اور جگہ بھی قیاس روایات میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا کوئی حصہ نہیں ہوتا علمائے حنفی کا قول ہے کہ اگر راوی فقیہ نہ ہو جیسے حضرت ابوہریرہؓ کہ ان کا گو حفظ حدیث میں بڑا مرتبہ ہے مگر فقاہت میں وہ مرتبہ نہیں تو ایسی صورت میں بالمقابل قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ماہ کے لئے اپنی بیویوں سے علیحدگی کا معاملہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اس علیحدگی کو بعض لوگوں نے طلاق سمجھ کر اسی رنگ میں معاملہ کو شہرت دے دی۔ یہاں تک کہ عموماً لوگوں نے سمجھ لیا کہ فی الواقع طلاق دے دی ہے حالانکہ امر واقع یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز طلاق نہیں دی تھی۔ چنانچہ خود حضرت عمرؓ نے آکر آنحضرت صلعم سے بالصرحت یہ دریافت کر کے کہ کیا آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ اس معاملہ کو صاف کیا۔ یا مثلاً جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فترت وحی کا ذکر کرتے ہوئے زہری نے یہ حصہ بڑھا دیا ہے کہ وحی کے رک جانے پر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بابند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتے تھے تاکہ اپنے آپ کو گرادیں اول تو خود اس واقعہ پر کوئی چشم دید گواہی نہیں۔ کیونکہ اس کی سند صرف زہری تک ہے جو ۵۰ھ میں پیدا ہوئے کسی صحابی تک نہیں پہنچائی گئی۔ دویم اس میں بھی اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ امام زہری نے کسی صحابی سے سن کر ہی ایسا لکھا ہوگا تاہم اس حد تک تو مشاہدہ ہوسکتا ہے کہ آپ پہاڑوں پر جاتے ہوں۔ لیکن یہ امر کہ اس غرض کے لئے جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرادیں محض کسی دیکھنے والے کا قیاس ہوسکتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ اور نیت پر کس طرح آگاہ ہوگیا۔ پس گو یہ واقعہ بخاری میں ہی مذکور ہو لیکن اسلئے قابل قبول نہیں کہ یہ زیادہ سے زیادہ کسی دیکھنے والے کا خیال ہے۔ حالانکہ جس امر کا تعلق نیت اور ارادہ سے ہو اس کا مشاہدہ نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں یہ قرآن و حدیث کے بھی خلاف ہی مگر اس وقت اس پر تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اور اگر یہ سوال ہو کہ پھر آپ پہاڑوں پر جاتے کیوں تھے تو میں کہتا ہوں جس غرض کے لئے غار حرا میں جاتے تھے مخلوق خدا کا درد دل میں بھرا ہوا تھا۔ وحی شروع ہو کر رک گئی اس گھبراہٹ میں عاشق کی طرح سرگردان پھرتے تھے +

تعامل میں آئی ہوئی احادیث اور دوسری احادیث میں فرق

پس حق یہ ہے کہ گو بخاری اور اس کے بعد باقی صحاح ستہ کی احادیث کا ہم بڑا مرتبہ یقین کرتے ہیں اور جو کچھ ان لوگوں نے احادیث پر تنقید کرنے میں کوشش کی اب ہم اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرسکتے اور نہ ہی ہمارے ہاتھ میں وہ سامان ہیں جن سے ہم ایسا کرسکیں لیکن تاہم حدیث کی تنقید کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ نہ کسی بزرگ نے یہ کہا کہ احادیث کو جس حد تک ہم پرکھ چکے اس کے آگے قدم اُٹھانا یا کوئی مزید تحقیق کرکے ان احادیث میں سے جن کو ہم نے صحیح سمجھا ہے کسی حدیث کو غلط قرار دینا گناہ ہے ان بزرگوں نے ظن غالب سے ان احادیث کو صحیح سمجھا اور جن کو رد کیا ان کو بھی ظن غالب سے رد کیا۔ اب اس میں کچھ شک نہیں کہ اس مجموعہ میں بہتیری احادیث ایسی ہیں جن کی صداقت پر تعامل اُمت نے مہر لگادی ہی۔ اور اکثر مسائل دینی کے متعلق ایسی ہی احادیث ہیں کہ صحابہ نے نبی کریم صلعم کو ایک کام کرتے دیکھا اور اسی طرح کیا۔ صحابہ کے بعد میں آنے والی نسل نے اسی طرح وہ کام صحابہ کو کرتے دیکھا اور خود کیا اور اس طرح پہ یہ سلسلہ تعامل ہم تک پہنچا۔ جن احادیث پر اس صداقت کی مہر ہی وہ یقین کے مرتبہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔

لیکن اس کے علاوہ بھی احادیث ہیں جن میں فضائل یا قصص یا پیشگوئیاں یا حالات تاریخی وغیرہ امور درج ہیں۔ جو روزانہ زندگی میں ہر شخص کے کام آنے والی چیزیں نہیں۔ ان میں سے جن احادیث کو صحت کے ساتھ تواتر یا شہرت کا مرتبہ حاصل ہو وہ بھی ایک اعلیٰ مرتبہ پر ہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بہتیری احادیث ایسی ہیں گو وہ صحاح میں ہی راہ پا گئی ہیں جن کو ان اصول تنقید کے ماتحت لایا جا سکتا ہے جن کا ذکر خود محدثین نے کیا ہے اور جس طرح بلحاظ روایت وہ احادیث جرح کے ماتحت آسکتی ہیں اسی طرح بلحاظ درایت بھی جرح کے ماتحت آسکتی ہیں۔

روایت میں غلطی کا امکان

یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ حدیث کو حفاظت قرآن کریم کا مرتبہ نہیں ملا۔ اور نہ دنیا میں کسی اور کتاب کو ایسی حفاظت نصیب ہوئی اعلےٰ پایہ کے محدثین نے بلاشبہ ایسے راویوں کو ترک کرنے کی کوشش کی ہے جو جھوٹ یا نسیان وغیرہ متہم ہوئے بایں خود بخاری کی اسنادوں میں بھی کئی ایک ایسے راوی ہیں جن پر جرح ہوئی ہے۔ اور دوسرے محدثین نے تو اس بارہ میں امام صاحب کے برابر سختی سے کام نہیں لیا۔ البتہ محدثین کی مجموعی شہادت بڑا وزن رکھتی ہے۔ کیونکہ ان سب نے الگ الگ اور اپنے طور پر تحقیق کی۔ لیکن علاوہ اس امر کے کہ کوئی راوی متہم ہو۔ یا قوی نہ ہو روایت کے سلسلہ میں اور بھی کئی مشکلات ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسی لئے یہ ضروری ہے کہ تعامل کی احادیث اور احادیث متواتر یا مشہور کو چھوڑ کر باقی احادیث میں بالخصوص ایسی احادیث میں جن میں قصص وغیرہ مذکور ہیں بہت احتیاط سے کام لیا جائے خود صحابہؓ نے بھی دوسرے صحابیوں سے باوجود اس کے کہ وہ ان کو کذب سے متہم نہیں کرتے تھے۔ احادیث کے قبول کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت ابن عمرؓ کی حدیث آتی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ میت کو پسماندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب کیا جاتا ہے تو وہ صاف فرماتی ہیں کہ بلاشبہ انہوں نے جھوٹ نہیں بولا مگر ان سے خطا ہو گئی۔ آنحضرت صلعم نے کسی یہودی میت کا ذکر کرتے ہوئے یوں فرمایا تھا کہ اس کے پسماندگان اس پر رو رہے ہیں حالانکہ اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ ایسا ہی قلیب بدر والی حدیث کے متعلق ہے صحیح مسلم کتاب الجنائز۔ بخاری میں مذکور ہے۔ کہ جب محمود ابن الربیع الانصاری نے عتبان بن مالک سے حدیث بیان کی جس میں آتا ہے فان اللہ قد حرم علی النار من قال لا الہ الا اللہ یبتغی بذالک وجہ اللہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص

کو آگ پر حرام کر دیا ہے جو لا الہ الا اللہ کہے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ایسا کرے۔ تو حضرت ابو ایوب انصاری نے یہ سن کر اس حدیث کے تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرمایا واللہ ما اظن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال ما قلت قط خذا کی قسم میں یقین نہیں کرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی وہ بات فرمائی ہو جو تم کہتے ہو (یہ ایام جنگ کا واقعہ ہے جب حضرت ابو ایوب بھی جنگ میں شامل تھے جس میں وہ شہید بھی ہوئے بجائے کہانیاں سنانے کے اور بنانے کے جیسا کہ میور کا خیال ہے یہاں محض قرائن کی بنا پر ایک صحابی ایک حدیث کا انکار کر رہے ہیں) اور خود محمد داس بارہ میں متامل ہو گئے۔ کیونکہ انہوں نے یہ عہد کیا کہ میں دوبارہ عتبان بن مالک سے ضرور یہ سوال کروں گا جیسا کہ اسی حدیث میں مذکور ہے گویا انہوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے میں ہی الفاظ کو ٹھیک ضبط میں نہ رکھ سکا ہوں (بخاری باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ) ایسا ہی حضرت ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت کو قابل اعتراض جانا جب انہوں نے کہا کہ جس چیز کو آگ نے چھوا ہو اس سے وضو لازم آتا ہے۔ ترمذی باب الوضوء مما مست النار یہ اس قسم کی بھی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے اور کسی وقت ایسا بھی ہو گیا ہے کہ ایک بزرگ جو حدیث کی حفاظت میں سخت محتاط ہیں ان سے بھی خطا ہو گئی ہے۔ اور جب صحابہ تک میں یہ جائز ہے تو بعد کے بزرگوں میں بھی ایسا ہونا قرین قیاس ہے۔

روایت بالمعنی علاوہ اس کے کہ روایت کے بیان کرنے والے کو غلطی لگ سکتی ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث کی روایت میں روایت بالمعنی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف وہ لوگ بھی ہیں جن کے الفاظ حدیث کو حیرت انگیز طریق پر محفوظ رکھنے کی شہادتیں ہیں۔ دوسری طرف ایسے بزرگ بھی ہیں جو فرماتے ہیں کہ معنی کو محفوظ رکھنا کافی ہے۔ جامع ترمذی کتاب العلل میں ایسے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف اگر یہ شہادتیں موجود ہیں کہ ابراہیم نخعی نے شہادت دی کہ ابی زرعہ بن عمرو بن جریر نے ایک دفعہ مجھ سے حدیث بیان کی تھی پھر میں نے اس سے بعد دو سال کے پوچھی تو اس نے ایک حرف بھی اس سے قطع نہ کیا۔ یا عبدالملک بن عمیر نے کہا کہ میں حدیث بیان کرتا ہوں اور اس سے کوئی حرف چھوڑتا نہیں ہوں۔

یا قتادہ نے کہا کہ جو کچھ میرے کانوں نے سنا ہے اس کو میرے دل نے نگاہ رکھ لیا ہے۔ تو دوسری طرف یہ بھی قول ہے فاما من اقام الاسناد وحفظہ وغیّر اللفظ فان ھذا واسع عند اھل العلم اذا لم یتغیر المعنی یعنی جو کوئی اسناد کو قائم رکھے اور اس کو یاد رکھے اور الفاظ کو بدل دے تو یہ صورت اہل علم کے نزدیک بہت فراخ ہے بشرطیکہ معنی متغیر نہ ہوں۔ یا واثلہ بن اسقع کا قول اذا حدثناکم علی اللحن فحسبکم جب ہم تم سے حدیث بالمعنی کریں تو یہ تمہارے لئے کافی ہے یا محمد بن سیرین کا قول کنت اسمع الحدیث من عشرۃ اللفظ مختلف والمعنی واحد یعنی میں دس آدمیوں سے حدیث سنتا تھا الفاظ مختلف ہوتے تھے اور مطلب ایک ہوتا تھا۔ یا ابن عون کا قول کہ ابراہیم نخعی اور حسن اور شعبی حدیث بالمعنی بیان کرتے تھے۔ یا حسن کا قول کہ جب تم اصل مطلب حدیث کا پالو تو وہ کافی ہے اذا اصبت بالمعنی اجزاک۔ یا سفیان ثوری کا قول ان قلت لکم انی احدثکم کما سمعت فلا تصدقونی انما ھو المعنی اگر میں تم کو کہوں کہ میں تم سے بعینہ وہ بات کرتا ہوں جو میں نے سنی تو میری تصدیق نہ کرو۔ وہ صرف معنی ہوتا ہے۔ اور وکیع کا قول ہے ان لم یکن المعنی واسعا فقد ھلک الناس اگر حدیث بالمعنی کی وسعت نہ ہوتی تو لوگ ہلاک ہو جاتے۔ پس معلوم ہوا کہ اگر ایک طرف حدیث کے الفاظ کو بعض حالات میں یاد رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تو دوسری طرف کثرت سے یہ شہادت بھی موجود ہے کہ صرف مطلب کو بیان کر دینا بھی کافی سمجھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث میں جن کا تعلق اہم مسائل دینی سے ہے الفاظ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسری احادیث میں بالمعنی روایت کر دینی بھی کافی سمجھی گئی ہے۔

صداقت حدیث کے پرکھنے کے لئے سب سے بڑا معیار

پس باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے بھی احتمال غلطی کا ہو سکتا ہے اسی لئے بہت سے بزرگ حدیث کے نقل کرنے میں بہت محتاط پائے جاتے ہیں۔

ابن ماجہ باب التوقی فی الحدیث میں عمرو بن المیمون سے روایت ہے کہ وہ بلاناغہ ہر پنجشنبہ کی شام کو حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس جاتے تھے (کیونکہ آپ جمعرات کے دن وعظ کیا کرتے تھے) اور انہوں نے کبھی حضرت عبداللہ کی زبان سے یہ نہیں سنا کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا اور پھر لکھا ہے کہ ایک دن ایسا انہوں نے کہا تو بہت ہی مضطرب ہوئے اور فرمایا کہ شاید آپ نے اس سے کچھ کم فرمایا

یا زیادہ یا اس کے قریب قریب یا اس کے مشابہ۔ ایسا ہی اسی باب میں محمد بن سیرین سے یہ روایت ہے کان انس بن مالک اذا حدث عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حدیثا ففزع منہ قال او کما قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یعنی انس بن مالک جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان فرماتے تو آپ گھبرا جاتے اور کہتے کہ یوں فرمایا یا جیسا فرمایا ہو رسول اللہ صلعم نے اور اسی وجہ سے بعض صحابہ بہت کم حدیث بیان کرتے تھے۔ پس اگر ایک طرف حدیث کی عزت کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے تو دوسری طرف چونکہ ایک بات کے درست طور پہ نہ پہنچنے سے یا ایک بات کے بھول جانے سے یا الفاظ میں ادل بدل یا کمی بیشی ہو جانے سے احتمال غلطی کا پیدا ہو سکتا ہے اس لئے ان احادیث میں بھی جن کو صحیح کہا گیا ہے۔ اور بالخصوص اس حصہ میں جس پر تعامل کی مہر صداقت نہیں لگی یا جس کو تواتر یا شہرت کا مرتبہ نہیں ملا۔ ایک اس سے بلند تر معیار کی ضرورت ہے جو ظن سے بالکل پاک ہو۔ اور جس میں ادنے شک کا بھی احتمال نہ ہو۔ اور یہ معیار خدا کے فضل سے ہمارے ہاتھ میں موجود ہے اور وہ قرآن شریف ہے جس کے متعلق نہ صرف اس کی حفاظت کا ہی ذمہ اللہ تعالے نے خود لیا انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ بلکہ اس کے اندر سارے اصول کو واضح اور محکم الفاظ میں بیان کر کے ایک ایسا معیار ہمارے ہاتھ میں دے دیا جس کے ہوتے ہوئے ہم حق و حکمت کی راہ سے ادھر اُدھر نہیں ہو سکتے ✦

قرآن کا حدیث پر فیصلہ کن ہونا

پس ہدایت کی رو سے حدیث کو پرکھنے کے لئے سب سے بڑا معیار ہمارے ہاتھ میں قرآن کریم ہے جو تمام شکوک اور ظنوں کی آمیزش سے پاک ہے اور جس سے بڑھ کر کوئی یقینی اور قطعی کلام نہیں۔ وہی اصل بنیاد ہے اور ہر ایک چیز سب سے پہلے اسی پر پرکھی جائے گی۔ قرآن شریف تمام اسلامی فرقوں کے ہاتھ میں ایک ہے۔ روایات میں اختلاف ہے۔ قرآن کریم کی جو حفاظت ہوئی وہ حدیث کی نہیں ہوئی اور بوجہ وحی متلو ہونے کے اس کا مرتبہ بھی حدیث سے بڑھ کر ہے اور وہ سب پر مقدم ہے۔ خود صحابہ رضی اللہ تعالے عنہم نے بھی احادیث کو قرآن شریف پر پرکھا ہے۔ بلکہ حضرت عائشہ نے قرآن کریم کو نبی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کچھ ارشاد فرمانے پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب العلم میں ابن ابی ملیکہ کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ کے متعلق ہے کانت لا تسمع شیئا لا تعرفہ

الا راجعت فیہ یعنی آپ کوئی بات آنحضرت صلعم کے منہ سے نہ سنتی تھیں جس کو آپ پہچانتی نہ ہوں مگر اس میں آپ سے مراجعت کرتی تھیں اور اسی حدیث میں آگے آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من حوسب عذب جس کا حساب لیا گیا اس کو عذاب دیا جائے گا۔ تو صدیقہؓ نے عرض کیا اولیس یقول اللہ عزوجل فسوف یحاسب حسابا یسیرا یعنی کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا کہ ایسے شخص کا حساب آسانی سے لیا جائے گا۔ تو یہاں حضرت عائشہ صدیقہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کو قرآن پر آپ کے روبرو عرض کیا۔ اور آپ نے بھی اس کا جواب جو دیا وہ یہی ہے کہ اپنے قول میں اور قرآن شریف میں تطبیق کرکے دکھائی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ تم میرے قول کو قرآن پر کیوں عرض کرتی ہو۔ بلکہ آپ نے ہی قول کی توجیہ فرمائی ولکن من نوقش الحساب یہلک یعنی جس سے سختی سے حساب لیا جائے گا وہ ہلاک ہوجائے گا گویا بتا دیا کہ من حوسب سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے سختی سے حساب لیا جائے گا۔ پس معلوم ہوا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ بھی قرآن شریف کو مقدم کرتے تھے۔ اور حفظ مراتب یہی چاہتا ہے کہ قرآن شریف کو ہر چیز پر مقدم کیا جائے کیونکہ اس کو وحی متلو ہونے کا بلند مقام حاصل ہے جو حدیث کو حاصل نہیں۔ اسی طرح پر جب حضرت عائشہ کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو آپ نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی ولا تزر وازرۃ وزر اخری کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا گویا اس سے یہ استدلال کیا کہ نوحہ کرنے والوں کے گناہ کا اثر مردہ پر کس طرح پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ قرآن شریف کے مخالف ہے جس کے رو سے ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں پڑتا چنانچہ صحیح مسلم میں یہ واقعہ کتاب الجنائز میں مذکور ہے۔ کہ جب حضرت ابن عمر کی یہ بات حضرت عائشہ صدیقہ کے سامنے پیش کی گئی تو آپ نے آیت قرآن کو پیش کرنے کے بعد یہ بھی فرمایا انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطئ۔ یعنی تم ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہو جو نہ جھوٹے ہیں اور نہ جھٹلائے گئے ہیں لیکن بعض وقت سننے میں خطا ہوجاتی ہے۔ ایسا ہی اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک یہودی عورت کے متعلق یہ لفظ فرمائے تھے جس کا نوحہ کیا جا رہا تھا انہم لیبکون علیہا وانہا لتعذب فی قبرہا۔ یہ اس پر روتے ہیں اور اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ ایسا ہی واقعہ قلیب بدر والوں کے سننے کے متعلق

لکھا ہے یعنی کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرک مقتولین کے متعلق فرمایا تھا انہم لیسمعون ما اقول یعنی وہ سنتے ہیں جو میں کہتا ہوں تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ان کو ٹھیک یاد نہیں رہا۔ آپ نے کہا تھا انہم لیعلمون ان ما کنت اقول لہم حق وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ میں ان کو کہتا تھا وہ سچ نکلا اور پھر حضرت عائشہؓ نے یہ آیت پڑھی انک لا تسمع الموتی تو مردوں کو نہیں سنا سکتا ان روایات کے متعلق ہمارا کچھ بھی خیال ہو یہ ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ نے قرآن شریف پر حدیث کو عرض کیا اور جہاں ظاہر طور پر اس کو مخالف پایا تو حدیث کو صحیح نہیں سمجھا۔ ایسی ہی اور بھی کئی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ جب کسی روایت کو قرآن شریف کے خلاف سمجھتے تھے تو اُسے ترک کر دیتے تھے۔

اس معیار سے نہ ہم صرف مسائل کے متعلق احادیث کی صحت کو ہی پرکھ سکتے ہیں بلکہ تاریخ کے متعلق سیرت کے متعلق۔ اور قصص کے متعلق بہت سی باتوں کے حل کرنے میں قرآن شریف ہمیں ایسی راہ پر چلاتا ہے کہ انسان ٹھوکر سے بچ سکتا ہے۔ یہ موقعہ تفصیل کا نہیں لہٰذا میں چند باتوں کا ذکر کرتا ہوں۔ قرآن شریف خود فرماتا ہے ان علینا جمعہ قرآن کریم کو جمع کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا اپنا کام ہے۔ اور فرماتا ہے انا لہ لحافظون۔ ہم قرآن شریف کی تحریف سے حفاظت کریں گے۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ باطل اس میں دخل نہیں پا سکتا۔ پس اگر کسی حدیث کا یہ مضمون ہو کہ فلاں آیت یا سورت قرآن شریف میں ہوتی تھی۔ جواب نہیں تو وہ حدیث غلط ہے۔ مثلاً صحیح مسلم کی وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ قرآن شریف میں کوئی سورت ہوتی تھی جس میں یہ لفظ آتے تھے لو کان لابن ادم وادیان من مال لابتغی وادیًا ثالثا ولا یملا جوف ابن ادم الا التراب یا وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ قرآن شریف میں عشر رضعات کا ذکر تھا۔ پھر پانچ کا (مسلم کتاب الرضاع) اسی قسم کی دوسری احادیث باوجود مسلم میں ہونے کے قابل قبول نہیں ہیں۔ اور نہ صرف قرآن شریف سے ہی ان کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ دوسری احادیث بھی جو تعداد میں زیادہ اور معتبر بھی زیادہ ہیں۔ ان کی تردید کرتی ہیں۔ یا مثلاً قرآن شریف حضرت ابراہیم کے متعلق فرماتا ہے انہ کان صدیقا نبیا وہ صدیق نبی تھا اور صدیق اس کو کہتے ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اور ایک حدیث کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ تو وہ حدیث قابل قبول نہیں۔ اس نبی کی طرف جس کو قرآن شریف صدیق کہتا

سے جھوٹ منسوب کرنے سے یہ بہت سہل ہے کہ ایک راوی کی طرف غلطی یا جھوٹ کو منسوب کیا جائے جیساکہ علامہ مازری نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے جس میں ہے کہ حضرت عباس نے حضرت علی کے متعلق یہ لفظ کہے تھے اقض بینی وبین ھذا الکاذب الآثم الغادر الخائن علامہ مازری کہتے ہیں اذا انسدّت طرق تاویلھا نسبنا الکذب الی رواتھا یعنی جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رُک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے (نووی شرح مسلم) پس اگر حضرت علیؓ کو جھوٹا کہنے کی بجائے راویوں کو جھوٹا کہنا انسب ہے تو حضرت ابراہیم کو جھوٹا کہنے کی بجائے کیوں راوی کو جھوٹا یا غلطی پر نہیں کہا جاسکتا۔ یا مثلاً قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ ہدایت ہمیشہ بنی آدم کے لئے اُترتی رہی اور وہی اس کے مورد رہے نہ دیگر حیوانات تو اب ایک حدیث اگر یہ بیان کرے کہ ایک بندر کو دوسرے بندروں نے زنا کرنے کے جرم میں سنگسار کیا تھا تو اس حدیث کو غلط کہا جائیگا گو وہ بخاری میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور فی الحقیقة یہ حدیث تو عامہ عقل انسانی کے بھی خلاف ہے۔ یا مثلاً قرآن کریم اول سے آخر تک بتوں کی مذمت سے بھرا ہوا ہو۔ اور کوئی حدیث یہ کہے کہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کی تعریف بھی کی تھی۔ اور تلک الغرانیق العلی ان کے متعلق نازل ہوا تھا تو ایسی حدیث پھینکنے کے قابل ہے۔

خود حدیث سے قرآن کریم کے حدیث پر مقدم کیا جانے کا ثبوت

علاوہ ان استدلالات کے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے اخذ کئے گئے ہیں جن سے قرآن شریف کا حدیث پر مقدم ہونا ثابت ہوتا ہے ترمذی اور ابوداؤد میں ایک حدیث ہے جو ہمارے مدعا کو صفائی سے صحیح ثابت کرتی ہے یعنی یہ کہ قرآن شریف کو حدیث پر مقدم کرنا ضروری ہے۔ ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت معاذ بن جبل سے ذیل کی حدیث روایت کی ہے عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثه الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال فبسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنة رسول اللہ قال اجتهد رائی و لا آلو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہ وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی به رسول اللہ یعنی معاذ بن جبل سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کی طرف (حاکم بنا کر) بھیجا آپ نے

فرمایا۔ جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے آئے تو کس طرح فیصلہ کیا کروگے۔ انہوں نے عرض کیا میں اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ۔ عرض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت میں نہ پاؤ۔ عرض کیا تب میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے رسول اللہ کے رسول کو وہ توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔ اس حدیث سے نہ صرف صحابہؓ کا عمل ہی قرآن شریف کو مقدم کرنے کا صراحت سے ثابت ہے۔ بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر یہ بات بیان کی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاف الفاظ میں اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ خود آپؐ نے ہی صحابہؓ کو یہ طریق بتایا تھا۔ کہ کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کیلئے اول قرآن کریم کو دیکھو اس کے بعد حدیث کو اور اس کے بعد خود اجتہاد کرو۔ گویا جو مرتبہ اجتہاد کو بمقابلہ سنت یا حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہے وہی حدیث یا سنت کو بمقابلہ قرآن کریم حاصل ہے۔ یہ حدیث اس سوال کا ہمیشہ کے لئے قطعی طور پر فیصلہ کرتی ہے۔ اور اہل حدیث کے اس گروہ کی غلطی پر بیّن دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف بغیر حدیث کے ہماری سمجھ میں ہی نہیں آسکتا۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے فروعی مسائل میں اور بہت سی تفصیلات دینی میں قرآن شریف کے ساتھ ہم کو حدیث کی بھی ضرورت ہے مگر یہ درست نہیں کہ بغیر حدیث کے قرآن شریف ہمیں کچھ کام ہی نہیں دے سکتا ورنہ حضرت معاذ یوں نہ فرماتے کہ کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے میں قرآن شریف کی طرف رجوع کروں گا وہاں صراحت سے نہ ملے تو پھر حدیث کی طرف اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر رضامندی فرماتے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن و حدیث دونوں ہمارے دین کی بنیاد ہیں۔ مگر مقدم کو مقدم اور موخر کو موخر نہ کرنا ویسی ہی غلطی ہے جیسے موخر کو بالکل ترک ہی کر دینا۔ ایک افراط ہے تو دوسری تفریط اس تقدم کی طرف قرآن شریف نے خود بھی صفائی سے اشارہ کیا ہے کیونکہ ہمیشہ اللہ کی اطاعت کو رسول کی اطاعت پر مقدم کرکے بیان کیا ہے۔ اور بار بار یونہی فرمایا ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول۔

اطیعوا اللہ والرسول۔ پس یوں قرآن و حدیث دونوں خود تصریح سے قرآن کریم کے حدیث پر مقدم کرنے کو ضروری ٹھہراتے ہیں۔

قرآن کریم احادیث کے نقص کا علاج کرتا ہے

غرض قرآن کریم ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا معیار حدیث کے پرکھنے کے لئے ہمارے ہاتھ میں دیتا ہے اور یہ ہمارے لئے مقام فخر ہے کہ اگر حدیث میں کسی قدر ظن اور احتمال کا پہلو ہے تو دوسرے مذاہب کی طرح وہ لاعلاج نہیں بالکل اس ظن کو دور کرنے کے لئے ہمارے ہاتھ میں ایک نہایت قوی حربہ قرآن شریف موجود ہے۔ جو شریعت کی اصلی بنیاد ہے۔ حدیث اپنی جگہ پر ہے تعامل تواتر اور شہرت نے اس کے ایک حصہ کو یقین کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے لیکن اس کا باقی حصہ بھی جس میں نہایت قیمتی جواہر ریزے ہیں ایسا نہیں کہ ایک عقلمند انسان اسے یوں ہی پھینک سکے۔ وہ ایک عظیم الشان علم ہے۔ وہ بہت سے علوم کا سرچشمہ ہے اس میں جو نقص نظر آتا ہے اس کی اصلاح کا سامان جہاں تک ہماری ضروریات متقاضی ہیں قرآن کریم میں موجود ہے۔ یوں تو دنیا کے بڑے بڑے مفید علوم ظن کا حصہ اپنے اندر رکھتے ہیں خود علم طب کو لے لو۔ اس میں کس قدر ظن سے کام لیا جاتا ہے مگر وہ انسان صحیح الدماغ نہیں جو علم طب کو اس لئے پھینک دے کہ اس میں کچھ ظنیات بھی ہیں۔ یہی حالت حدیث کی ہے بلاشبہ اس میں ظنیات بھی ہیں مگر جو شخص کوشش کرے گا وہ اس میں سے نہایت بیش قیمت معلومات نکال کر اسے دنیا کے لئے مفید بنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کا سامان اسلام میں رکھا ہے۔ قرآن کریم کا حامل خود فکر کی ضرورت

ایک ایک لفظ کامل صحت کے ساتھ یقین کے مرتبہ پر پہنچا ہوا ہے مگر وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک حصہ محکمات کا اور ایک متشابہات کا رکھا ہے۔ تا متشابہات پر غور کر کے انسانوں کے ذہن تیز ہوں۔ حدیث میں اگر فروع کی تفصیلات موجود ہیں تو کچھ حصہ ظن کا ساتھ رکھ دیا ہے تاکہ صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کچھ غور و فکر بجا رہو۔ حدیث پر قرآن کریم کو مقدم کر کے اصل گر بھی بتا دیا۔ باقی وجوہ جن سے حدیث پر جرح ہو سکتی ہے خود محدثین نے بتا دی ہیں اور وہ تمام اصول ہمارے لئے ہادی راہ ہیں۔ لیکن ان میں سے میں نے ایک بات کو خاص طور پر اس لئے انتخاب کیا ہے یعنی حدیث کو قرآن کریم کے ماتحت کرنا کہ اس زمانہ میں قرآن کریم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے سب سے بڑھ کر اسی کی ضرورت ہے اور اس لئے بھی کہ جہاں بعض لوگوں نے حدیث کے مرتبہ میں تفریط کی ہے دوسری طرف بعض نے قرآن کریم

کے برابر اس کو مرتبہ دے دیا ہے۔ اور حفظ مراتب کو مدنظر نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر صرف و نحو منطق فلسفہ بیان کی الجھنوں میں کچھ علم دین کا چربہ نظر آتا ہے تو صرف حدیث کے رنگ میں۔ قرآن کریم ہمارے درسوں میں سے قریباً مفقود ہی ہو چکا ہے۔ اگر کچھ پڑھایا جاتا ہے تو وہ بھی صرف و نحو کی خاطر۔ حالانکہ ہماری تمام ترقیوں کا راز اور ہماری تمام کامیابیوں کی جڑ صرف قرآن شریف تھا۔ اور اگر مسلمان پھر کچھ ترقی کر سکتے ہیں تو قرآن کریم کے ذریعے ہی کر سکتے ہیں۔ اسی کے ماتحت اسی کی تفسیر کے رنگ میں حدیث کو پڑھ کر اور بے بنیاد قصوں کو جو تفاسیر میں داخل ہو گئے ہیں ترک کر کے ۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تمت

سیرتِ خیر البشر

مؤلفہ

حضرت مولٰنا مولوی محمد علی صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی زیر طبع ہے

اور انشاء اللہ عنقریب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوگی۔

اس بےنظیر تصنیف میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی

کے حالات و واقعات پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ حضور صلعم کے اخلاق

فاضلہ پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاکہ بنی نوع انسان کے لئے بالعموم

اور اہل اسلام کے لئے بالخصوص روزانہ عملی زندگی کے مختلف شعبوں

بن مشعل راہ ہو۔ یہ نادر کارنامہ جن جواہر ریزوں پر مشتمل ہوگا اس کے

لئے قابل مصنف کی ذات کافی ضمانت ہے۔ جن کے تبحر علم اور

زور قلم کا اندازہ جناب ممدوح کی تصنیف انگریزی ترجمۃ القرآن سے بخوبی ہو سکتا

ہے جس کو نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ مغربی ممالک میں بھی عالمگیر مقبولیت حاصل ہو چکی ہے

مائلین کو آرڈر جلد رجسٹر کرانے چاہئیں تاکہ طبع اول میں مایوس نہ ہونا پڑے

درخواستیں بنام منیجر صاحب بک ڈپو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام احمدیہ بلڈنگس لاہور

کتبخانہ جامعہ عثمانیہ

...انِ عرفان کے چند قطرے

کتابیں جن کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے

نام کتاب — قیمت

براہین احمدیہ۔ مذہبی دُنیا کے فاتح اعظم (مسیح موعود) کی تصنیف لطیف اور آخری فتوحات اسلامی کی تمہید مجلد

ملفوظات احمدیہ صداقت و عظمت اسلام اور ظلمت کفر پر ید بیضا، کی نمود مجموعہ تقاریر مسیح موعود مجلد

فتح اسلام و توضیح مرام۔ دعاوی مسیح موعود کے متعلق رفع شکوک حل و قایق قرآن از مسیح موعود ۱۰؍

ٹیچنگز آف اسلام حقایق و معارف قرآن اور اس کے علوِ بیان پر مسیح موعود کے معرکۃ الآرا لیکچر کا انگریزی ترجمہ مجلد

دُرِّ ثمین۔ فیضان مسیحیت کا معجز نما کلام مسیح موعود کی اُردو و فارسی نظموں کا مجموعہ کاغذ اعلےٰ خط خوش

ازافادات حضرت مجدد الدین امیر قوم ایدہ اللہ بنصرہٖ +

نکات القرآن۔ قرآن کریم کے ابتدائی پانچ پاروں پر لطیف تفسیری نوٹ و حل مشکلات

جمع قرآن۔ جمع قرآن کے متعلق تحقیقی تاریخی واقعات اور اعتراضات کے تفصیلی جوابات ۱۲؍

النبوۃ فی الاسلام۔ نبوت۔ رسالت۔ محدثیت۔ مجددیت پر تفصیلی بحث اور مقام مسیح موعود پر سیر کن نظر مجلد

مسیح موعود۔ وفات عیسیٰؑ۔ نزولِ مسیح اور آمد ابن مریم پر قرآن کریم اور احادیث کا متفقہ فیصلہ مجلد

آیت اللہ۔ مسیح موعود اور مولوی ثناء اللہ کے مشاجرہ پر آیت اللہ کا محاکمہ ۲؍

حقیقۃ المسیح۔ فضیلت مسیح کی حقیقت کا انکشاف اور قرآن کریم میں مسیحؑ کا حقیقی مقام ۲؍

عصمتِ انبیاء۔ عصیان نبوت اور عصمت انبیاء پر نصوص فرقانیہ کی رو سے تفصیلی تبصرہ ۹؍

غلامی۔ اسلام حریت اور مساواتِ نسلِ انسانی کا مبشر اول ہے مساوات یورپ اور اسلامی غلامی کا نمونہ ۴؍

القول الممجد۔ فی تفسیر اسمہٗ احمد از احسن المتکلمین حضرت مولانا احسن امروہوی سفسطۂ محمودیہ کا قلع قمع ۱۰؍

عسل مصفیٰ۔ وفاتِ مسیح۔ نزول ابن مریم پر ایک جامع اور مبسوط کتاب دو ضخیم جلدوں میں مجلد

مرقاۃ الیقین۔ ایقان اور معرفت کے عارف بدل علامۂ دوران حضرت مولانا نور الدینؓ کے بے نظیر سوانح

درخواستیں

بنام منیجر صاحب بک ڈپو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام احمدیہ بلڈنگس لاہور